هٰذا بلاغ للناس
ماہنامہ
البلاغ
کراچی
زیر سرپرستی:
حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم

ربیع الاول ۱۳۸۸ھ

جون ۱۹۶۸ء

دار العلوم کراچی کا ترجمان

کراچی

فی پرچہ ۵۶ پیسے ، سالانہ چھ۶ روپے

ممالک غیر سے ، ایک پونڈ سالانہ

بذریعہ ہوائی ڈاک ۲ پونڈ

ڈاک کا پتہ

البلاغ دار العلوم کراچی ۱۴

فون ——— ۳۰۱۱۷

ہندوستان میں ترسیل زر کا پتہ

مولانا ظہور الحسن صاحب خانقاہ امدادیہ

تھانہ بھون ضلع مظفر نگر

(بھارت)

محمد تقی عثمانی

استاذ دار العلوم کراچی

مدیر انتظامی

خلیل الرحمٰن نعمانی مظاہری

ناظم نشر و اشاعت دار العلوم

کراچی

جلد ——— ۲

شمارہ ——— ۳

ترتیب

ذکر و فکر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سادگی اپنوں کی دیکھ اوروں کی عیاری بھی دیکھ

حمد و ستائش اس ذات کیلئے ہے جس نے اس کارخانۂ عالم کو وجود بخشا

اور

درود و سلام اس کے آخری پیغمبرؐ پر جنھوں نے اس جہان میں حق کا بول بالا کیا

بیت المقدس میں اسرائیل کے ناپاک اور غاصبانہ قبضے کو پورا ایک سال بیت گیا۔ اس دوران کوئی اشتعال انگیز کارروائی ایسی نہیں ہے جو جارحیت کے اس عفریت نے سرزمین مقدس پر روا نہ رکھی ہو، اس نے وہاں کے بیکس اور مجبور مسلمانوں پر ظلم وستم بھی ڈھائے، قبۃ الصخرہ کے عین سامنے جبین حیا کو عرق عرق کر دینے والی شرمناک حرکتیں بھی کیں، بیت المقدس میں فوجی پریڈ کر کے اپنے جارحانہ عزائم کا کھلم کھلا مظاہرہ بھی کیا، غرض وہ سب کچھ کیا جس کی ایک کمینہ خصلت دشمن سے توقع کی جا سکتی تھی، ــــــ لیکن دوسری طرف اپنے آپ کو دیکھئے تو ہمارا حال یہ ہے کہ ہم ابھی تک یہ بھی طے نہیں کر سکے کہ اس لیئے پر غور کرنے کے لئے سربراہوں کو سر جوڑ کر بیٹھنا چاہئے یا نہیں؟ اس سرد مہری کا نتیجہ یہ ہے کہ اسرائیل کی دراز دستیاں بڑھتی چلی جا رہی ہیں اور ایک سال کے اس طویل عرصے میں مشترک جوابی اقدام کے لئے ہمارا کوئی قدم آگے نہیں بڑھ سکا۔ اور اب ۵ر جون کو پورے عالم اسلام میں "یوم احتجاج" منانے کی تجویز پیش کی جا رہی ہے۔ اس دن سارے عالم اسلام میں اس جارحیت کے خلاف مظاہرے ہوں گے، جلسوں، جلوسوں، تقریروں اور قراردادوں کے ذریعہ اسرائیلی قبضے کے خلاف احتجاج کیا جائیگا۔ اتنے عظیم سانحے کو بالکل خاموشی کے ساتھ پی جانے سے تو بہر حال یہ بہتر ہے، لیکن اصل معاملے پر اس کا اثر اس سے زیادہ کیا ہو سکتا ہے کہ بیت المقدس کے وہ بام و در جنہوں نے کبھی صلاح الدین ایوبی کے غیور سپاہیوں کو بیت المقدس کی آزادی کے لئے آگ اور خون سے کھیلتے دیکھا تھا، ۵ر جون کو ہماری "گرم گفتاری" کا بھی نظارہ کر لیں گے۔

گذشتہ سال کے دوران عرب ممالک کے بعض سربراہوں نے بلاشبہ انفرادی طور پر اپنی سی کوششیں جاری رکھی ہیں، لیکن ان کوششوں کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے کسی شخص کے جسم پر بے شمار پھنسیاں نکل آئی ہوں، اور وہ اپنے خون کی اصلاح کی

فکر کرنے کے بجائے خارجی دواؤں سے ان پھنسیوں کو دبانا چاہتا ہو، اسرائیل عالم اسلام کے جسم پر ایک رستا ہوا ناسور ہے، اور اس کا علاج صرف اوپر اوپر پاؤڈر چھڑکنے یا مرہم لگانے سے نہیں ہوگا، اگر ان تدبیروں سے یہ زہریلا مادہ دب بھی گیا تو جسم کے کسی اور حصے پر اپنا اثر دکھائے گا۔ لہٰذا ہمارے لئے اصل غور طلب مسئلہ یہ ہے کہ یہ زہریلا مادہ آخر کیا ہے جو کبھی فلسطین کا مسئلہ لیکر کھڑا ہوتا ہے کبھی قبرص کبھی کشمیر میں اپنا اثر دکھلاتا ہے، کبھی حبشہ میں ہمیں یہ سوچنا ہے کہ اس زہریلے مادہ کی ابتدا کہاں سے ہوئی؟ یہ کیونکر ہمارے جسم میں داخل ہوا! اور اس سے نجات پانے کی کیا سبیل ہے؟

بات اگرچہ لمبی ہے مگر پیچیدہ ہرگز نہیں، قرآن کریم نے سورۂ نور میں ہم سے یہ وعدہ کیا ہے کہ:

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِی الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ۪ وَلَیُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِیْنَهُمُ الَّذِی ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَیُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا یَعْبُدُوْنَنِیْ لَا یُشْرِكُوْنَ بِیْ شَیْـًٔا

"تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے عمل صالح کئے ان سے اللہ نے وعدہ کیا ہے کہ اللہ انھیں زمین میں اپنی خلافت ضرور عطا کرے گا، جس طرح ان سے پہلے لوگوں کو عطا کی ہے اور جس دین کو ان کے لئے اس نے پسند کیا ہے اسے ضرور قوت عطا کرے گا۔ اور ان کے خوف کو یقیناً امن سے بدل دے گا، (پس) وہ میری عبادت کریں، میرے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں۔"

اگر ہم اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ اس کائنات کا خالق و مالک خدا ہے، اور یہاں کوئی ذرہ اس کے حکم کے بغیر نہیں ہلتا دنیا میں جتنے انقلابات آتے ہیں، زمانہ جتنی کروٹیں بدلتا ہے روئے زمین پر جتنے تغیرات رونما ہوتے ہیں وہ سب اسی کے حکم اور مشیت کے تحت ہوتے ہیں، اگر ہمارا اس بات پر ایمان ہے کہ قرآن اس کا سچا کلام ہے اور اس کا کوئی لفظ غلط نہیں ہو سکتا تو پھر ہمیں پوری سنجیدگی کے ساتھ اس بات پر غور کرنا چاہئے کہ ہمارے حق میں قرآن کریم کا یہ وعدہ کیوں پورا نہیں ہو رہا؟ ہمیں زمین میں قوت کیوں حاصل نہیں؟ ہمارا خوف "امن" سے کیوں نہیں بدلتا؟ کیا معاذ اللہ خداوند کریم کا یہ وعدہ محض ایک بہلاوہ ہے؟ آپ ذرا انصاف کے ساتھ غور فرمائیں گے تو صاف معلوم ہو جائے گا کہ اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ اپنی جگہ اٹل ہے، اور تاریخ اسلام کے ابتدائی دور میں دنیا اس کی صداقت کے کرشمے دیکھ چکی ہے، آج اگر ہمیں مصائب و آلام کا سامنا ہے تو یہ درحقیقت اس "ایمان" اور "عمل صالح" کی کمی ہے جسے قرآن کریم میں اس وعدے کے لئے لازمی شرط قرار دیا گیا ہے۔

آپ اگر اپنے ماضی قریب ہی کی تاریخ پر ایک سرسری نظر ڈال لیں گے تو اس حقیقت کے آشکار ہونے میں دیر نہیں لگے گی ہمارے اجتماعی المیہ کی ابتدا دراصل خلافتِ عثمانیہ (ترکی) کے خاتمے سے ہوئی ہے۔ اس وقت عالم اسلام کو جتنے مصائب و آلام درپیش ہیں، وہ درحقیقت اُس جال میں پھنسنے کے لازمی نتائج ہیں جو دشمنان اسلام نے ہم پر بڑی عیاری کے ساتھ ڈالا تھا اور جسے ہم نے خوشنما لباس سمجھ کر خوشی سے پہن لیا۔ یہ جال وہ "مغربی نظام تعلیم" تھا جو بقول لارڈ میکالے لایا ہی اس لئے گیا تھا کہ اس کے ذریعہ مسلمانوں میں ایک ایسی نسل تیار کی جائے جو اپنے رنگ و نسل کے لحاظ سے خواہ کچھ رہی ہو، لیکن اپنی ذہنیت، اپنی فکر اور اپنی معاشرت کے لحاظ سے سولہ صدی انگریز ہو کہنے کو تو یہ بات بڑی خوش آئند تھی کہ مسلمان ان علوم و فنون سے آشنا ہو رہے ہیں جنھوں نے یورپ میں نشأۃ ثانیہ حاصل کی تھی لیکن درحقیقت جس اسلوب پر اس نظام تعلیم کو ڈھالا گیا تھا اس نے نوجوانوں کی فکر و نظر کے زاویے ہی اگر بدل دیئے ان کو اپنے گھر کے تصورِ حیات سے بالکل ناواقف رکھا گیا، اور مغرب کے نظریات کی محبت و عظمت ان کے

دلوں میں جاگزین کر دی گئی، چنانچہ ان کی نظر میں زندگی کی قدریں ہی یکسر بدل گئیں، اور وہ "دین" جس میں ان کی فلاح و بہبود کے لئے سب کچھ تھا، یا تو انھیں ایک ڈھونگ نظر آنے لگا، یا زیادہ سے زیادہ اسلاف کا ایک مقدس ورثہ بن کر رہ گیا جس کا عملی زندگی میں کوئی عمل دخل نہیں تھا۔

اس ذہنیت نے جو زہریلے اثرات مسلمانوں میں پھیلائے ان کی فہرست بہت طویل ہے، لیکن انھیں میں سے ایک مہلک ترین اثر "قومیت" اور "وطنیت" کا وہ تصور تھا جس نے بالآخر مسلمانوں کے ناقابل تسخیر اتحاد کو پاش پاش کر کے رکھ دیا، دشمنان اسلام بارہا آزما چکے تھے کہ مسلمان کا اتحاد ان کے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ ہے، چنانچہ انھوں نے اپنے نظام تعلیم کے ذریعے "قومیت" کے وطنی تصور کی اس شان سے تبلیغ شروع کی کہ گویا اس نظریئے کو اختیار کئے بغیر کسی انسان کا "مہذب" قرار پانا ممکن ہی نہیں ہے وہ نوجوان جو مغربی نظام تعلیم سے متاثر ہو کر مغرب کی ہر آواز پر لبیک کہنے کے لئے تیار رہتے تھے، انھوں نے اس نظریئے کو ہاتھوں ہاتھ لیا، اور اپنے ہاتھوں سے اس جال کے پھندے تیار کئے جو خود ان کے لئے بُنا جا رہا تھا۔

عرب میں نظریۂ وطنیت Nationalism کی تاریخ کا اگر آپ مطالعہ فرمائیں تو معلوم ہوگا کہ وہاں اس نظریئے کے اولین بانی تمامتر عیسائی اور یہودی تھے۔ عہد حاضر کے معروف مستشرق فلپ کے حتّی اپنی کتاب "اسلام اور مغرب" میں لکھتے ہیں "یہ بنیادی طور سے سوریا اور لبنان کے عیسائی ہی تھے جنھوں نے اس مغربی متاع (نظریۂ قومیت) سے مصالحت کی ان کے شاعروں اور صحافیوں نے جو مصر پر برطانیہ کے قبضے کے دوران نسبۃً زیادہ آزادی کے ساتھ لکھتے تھے، وہ چنگاری پیدا کی جس نے نیشنلزم کے شعلے کو بھڑکایا۔ اس نظریئے کے نئے تصورات مثلاً حبِ وطن، قوم، یا بائے وطن، اور انسانی حقوق کے لئے انھوں نے نئے الفاظ گھڑے یا پرانے الفاظ میں ترمیم کی اسلئے کہ خلافت عثمانیہ کے جوئے سے آزاد ہونا دراصل نظریئے قومیت کی پیدائش پر موقوف تھا (Islam and the West, Newyork 1962 P. 91) نیز عرب کے ماضی قریب کا مورخ جارج انٹونیوس (George Antonius) اپنی کتاب "عربوں کی بیداری" (The Arab Awakening) میں مزید وضاحت اور تفصیل کے ساتھ لکھتا ہے۔

"عرب میں قومی تحریک کی پہلی منظم کوشش سلطان عبدالحمید کی تخت نشینی سے دو سال پہلے ۱۸۷۵ء میں شروع ہوئی جبکہ پانچ نوجوانوں نے جو بیروت میں سیرین پروٹسٹنٹ کالج کے پڑھے ہوئے تھے، ایک خفیہ سوسائٹی قائم کی، یہ سب عیسائی تھے، لیکن انھوں نے مسلمانوں اور دروزوں کو شامل کرنے کی اہمیت محسوس کی اور کچھ ہی عرصے میں مختلف مذاہب کے تقریباً بائیس افراد کو اپنا ممبر بنانے میں کامیاب ہو گئے۔"

آگے چلکر جارج انٹونیوس نے بتایا ہے کہ جن لوگوں نے عرب قومیت کی تحریک کو آگے بڑھایا ان میں دو آدمی سب سے زیادہ نمایاں تھے، ایک ناصیف یازجی اور دوسرے بطرس بستانی۔ یہ دونوں لبنان کے عیسائی تھے، بستانی ہی نے سب سے پہلے اس نعرہ کو چلایا کہ

حب الوطن من الایمان

"وطن کی محبت جزوِ ایمان ہے"

جبکہ اس سے قبل عرب اس نعرے سے واقف نہ تھے، مصنف نے تفصیل سے بتایا ہے کہ شروع میں مسلمانوں نے اس تحریک کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھا، مگر رفتہ رفتہ وہ بھی اس سے متفق ہوتے چلے گئے، اور جارج انٹونیوس کے الفاظ میں:

So it came to-pass that the ideas which had originally been sown by the Christians were now-roughly at the turn of the century-finding an increasingly receptive soil among the Muslims"

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ نظریات جن کے بیج دراصل عیسائیوں نے بوئے تھے، اب یعنی قریب قریب اس صدی کی ابتدا میں) ان کو مسلمانوں کے درمیان ایسی زمین مل گئی جو روز افزوں اثر پذیر تھی"

اسی طرح ترک نوجوانوں "میں بھی اسی تعلیم کے اثرات نے ترکی قومیت کا بت کھڑا کیا۔ یہاں بھی نظریہ قومیت کے بانی عیسائی تھے۔ ترکی کی مشہور مصنفہ خالدہ ادیب خانم اپنی کتاب "Conflict of East and West in Turkey" میں لکھتی ہیں کہ "ایک طرف ترکی کے نوجوان مسلمان جمہوریت کا نعرہ لے کر کھڑے ہوئے، اور دوسری طرف سلطنت عثمانیہ کے عیسائی باشندے نیشنلزم کو چمٹے ہوئے تھے" (ص ۵۱)

اس طرح انھوں نے عربوں اور ترکوں کو ایک دوسرے کے خلاف ابھار کر باہم برسرپیکار کر دیا۔ اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ عالم اسلام جو کبھی خلافتِ عثمانیہ کے تحت ایک جسم کی طرح تھا چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بٹ کر رہ گیا، پھر ان چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کو بھی عرصۂ دراز تک اپنے زیرِ انتداب رکھنے کے بعد کہنے کو تو دشمنانِ اسلام نے انھیں آزاد کر دیا لیکن چونکہ نئی تعلیم پائے ہوئے مسلمانوں کے ذہن ہی یکسر بدل چکے تھے اس لئے ذہنی اور عملی طور سے وہ درحقیقت ہمیشہ کے لئے مغرب کے "زیرِ انتداب" ہو کر رہ گئے۔ لارڈ کرومر (Lord cromer) اپنی کتاب "مصر جدید" (Modern Egypt) میں انگریزوں کے طرزِ عمل کی بالکل صحیح ترجمانی کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

"انگلینڈ اس بات کے لئے تیار رہتا کہ اپنے تمام استعماری مقبوضات کو جس قدر جلد ممکن ہو آزادی عطا کر دے کیونکہ ایسے دانشوروں اور سیاست دانوں کی ایک نسل ان ممالک میں پیدا ہو چکی تھی جو انگریزی تعلیم اور انگریزی ثقافت کے نظریات سے بہرہ ور ہو کر ان ملکوں کو سنبھالنے کے لئے تیار تھے۔ لیکن:

"Under no circumstances would the British Government for a single moment tolerate an independent Islamic State".

"برطانوی حکومت کسی بھی حال میں ایک لمحے کے لئے بھی کسی آزاد اور خود مختار اسلامی حکومت کو گوارا کرنے کے لئے تیار نہیں تھی"

مسلمانوں کے خلاف سازشوں کا یہ جال جو سالہا سال کی محنت سے تیار کیا گیا تھا، بالآخر بار آور ہوا، اور اول تو مسلم

ممالک چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بٹ کر خود بخود ہی کمزور پڑ گئے، پھر یہ چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بھی ذہنی اور عملی طور پر اپنے دین کے دور اور بہت دور چلے گئے۔ اب مغربی اقوام ان سے اپنی من مانی خواہشات پوری کرانے کے لئے بالکل آزاد تھیں انھوں نے جس کو چاہا ظاہری طور سے بھی غلام بنایا اور جس کو چاہا اپنی خود غرضانہ شرائط پر نام کی آزادی عطا کی، اور اسے ہمیشہ کے لئے کسی ایسے مسئلے میں الجھا دیا جس سے وہ کبھی باہر نہ نکل سکے۔

یہی وہ مقصد تھا جو خلافت عثمانیہ کے باقی رہتے ہوئے یہ مغربی قومیں کبھی حاصل نہ کر سکتی تھیں، کیونکہ خلافت عثمانیہ اپنے گئے گذرے دور میں بھی مسلمانوں کا ایک مشترکہ حصار تھا، اور اس کی موجودگی میں کسی کو ان کے حقوق غصب کرنے کی جرأت مشکل ہی سے ہوتی تھی

فلسطین کے مسئلے ہی کو دیکھ لیجئے اس علاقے پر تو سالہا سال سے یہودیوں کا دانت تھا، یہی وجہ ہے کہ جب برطانیہ نے انھیں آباد ہونے کے لئے یوگنڈا کے ایک علاقہ کی پیش کش کی تو یہودیوں نے اسے نامنظور کر دیا تھا اور وہاں آباد ہونے کے بجائے انھوں نے ۱۹۰۲ء میں تھیوڈور ہرزل (Theodore-Herzl) کو قائد بنا کر ایک وفد خلافت عثمانیہ کے فرمانروا سلطان عبدالحمید ثانی کی خدمت میں بھیجا اور ان سے درخواست کی کہ یہودیوں کو دوبارہ فلسطین میں آباد ہونے کی اجازت دی جائے، اور ساتھ ہی یہ پیش کش کی کہ اس "اجازت" کے صلے میں ہم ترکی حکومت کے بیرونی قرضے ادا کرنے کیلئے تیار ہیں۔

لیکن سلطان عبدالحمید ثانی نے اس درخواست کا جو جواب دیا وہ عرب نیشنلزم کے ان دلدادگان کے لئے سرمۂ بصیرت ہے جو ترکی خلافت کو اپنا سب سے بڑا دشمن خیال کرتے ہیں، تھیوڈور ہرزل اپنی ڈائری میں لکھتا ہے کہ سلطان عبدالحمید کا جواب یہ تھا

> "ڈاکٹر ہرزل کو باخبر کر دو کہ وہ آج کے بعد فلسطین میں یہودی ریاست قائم کرنے کی ہر کوشش سے دستبردار ہو جائیں، یہودی فلسطین کو صرف اس صورت میں حاصل کر سکتے ہیں جبکہ خلافت عثمانیہ ایک خواب و خیال ہو چکی ہو"

(Quoted by Mr. Ghulam Mohammad of Indonesia, *Muslimnews Karachi May 1968 P. 8*).

سلطان عبدالحمید کے اس جواب سے یہ لوگ اس بات سے تو قطعی طور پر مایوس ہو گئے کہ خلافت عثمانیہ کی موجودگی میں فلسطین پر قبضہ جمانے کی کوئی صورت ہو سکتی ہے، البتہ اس کے بعد انھوں نے خلافت عثمانیہ پر ضرب لگانے کی بھرپور کوششیں شروع کر دیں اور مغربی نظام تعلیم اور اس کے پھیلائے ہوئے قومی اور لادینی نظریات کے بل پر انھوں نے اس مقصد میں پوری کامیابی حاصل کی۔ خلافت عثمانیہ واقعۃً خواب و خیال ہوئی، اور اس کا نتیجہ اسرائیل کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔ اور ایک اسرائیل ہی کیا، عالم اسلام کے تمام اجتماعی مسائل واقعات کے اسی تسلسل کی پیداوار ہیں۔

ان طویل گذارشات سے ہمارا مقصد اس بات کی طرف توجہ دلانا ہے کہ اگر ہم واقعۃً ان مصائب و آفات سے رہائی حاصل کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں اپنے اس طرز فکر و عمل پر پوری سوجھ بوجھ کے ساتھ نظر ثانی کرنی پڑے گی جو ہم نے تقریباً ڈیڑھ سو سال سے اختیار کیا ہوا ہے، ہمارا اصل مسئلہ مغرب کی وہ اندھی تقلید ہے جس نے ہمارے پورے نظام زندگی کو تلپٹ کر کے رکھدیا ہے جس کی وجہ سے ہم "ایمان" اور "عمل صالح"

کی اس دولت سے محروم ہوئے جارہے ہیں، جو قرآن کریم کی تصریح کے مطابق ہماری قوت و شوکت کا اصل سرچشمہ ہے، ہماری مثال اس بھٹکے ہوئے مسافر کی سی ہے جو اپنی منزل کا راستہ بھول کر کسی "پیر تسمہ پا" کے پیچھے لگ گیا ہو، یہ "پیر تسمہ پا" ہمارے کاندھے پر سوار ہو کر ہمیں مسلسل ان راستوں پر چلا رہا ہے جو ہمارے لئے ہلاکت اور تباہی کے راستے ہیں لیکن ہماری بدنصیبی یہ ہے کہ ہلاکت کے کسی گڑھے میں گرنے کے بعد ہم پھر راستہ اسی "پیر تسمہ پا" سے پوچھتے ہیں۔ اور وہ تباہی کے ایک نئے غار کی طرف اشارہ کر دیتا ہے۔

افسوس ہے کہ عالمِ اسلام میں ابھی اس حقیقت کا شعور نہایت سست ہے۔ گذشتہ سال اسرائیل کے ہاتھوں شکست فاش کھانے کے بعد ہمیں ہوش آجانا چاہئے تھا، لیکن قبلۂ اول کے چھن جانے سے زیادہ کرب انگیز بات یہ ہے کہ ہم نے ابتک اس حادثے سے کوئی سبق حاصل نہیں کیا۔ ہماری ــــ اور بالخصوص عرب ممالک کی ــــ زندگی کا پہیہ بدستور اسی ڈھب پر گھوم رہا ہے۔ دین سے بے رخی کا وہی عالم ہے، تقلید مغرب کے ولولے دلوں پر اسی طرح حکمراں ہیں، عیش و عشرت کا شوق اسی طرح چٹکیاں لے رہا ہے، جفاکشی اور محنت کوشی کا جذبہ اسی طرح کوسوں دور ہے، اللہ اور اسلام کے بجائے "عرب قومیت" اور "مادر وطن" کے نعرے اسی زور و شور سے لگ رہے ہیں اور باہمی نااتفاقی نے ہمیں اسی طرح ٹکڑے ٹکڑے کیا ہوا ہے۔

ہماری گذارش یہ ہے کہ ۵ رجون کو یہودیوں کی جارحیت کے خلاف احتجاج کرنے کے ساتھ اپنی اس بیمار ذہنیت کے خلاف بھی احتجاج کیجئے جس نے یہود جیسی قوم کو ہم پر بری نگاہ ڈالنے کی جرأت عطا کی ہے، اسرائیلی قبضہ کے خلاف قرار دادیں منظور کرنے کے ساتھ اس "قبضے" کے خلاف بھی قرار دادیں منظور کیجئے جو اسرائیل کا ناپاک تخم بونے والوں نے ہمارے ذہنوں اور دلوں پر جمایا ہوا ہے۔ فلسطین کو اجنبی تسلط سے آزاد کرانے کے عزم کے ساتھ اس بات کا عزم بھی تازہ کیجئے کہ اپنے افکار کو اُن اجنبی اثرات سے آزاد کریں گے جنہوں نے ہمیں اپنے دین، اپنے ایمان، اور اپنی صراط مستقیم سے بھٹکا کر بے دینی، نفس پرستی، عیش کوشی اور غفلت شعاری کی راہ پر ڈال دیا ہے۔ اور جس کی وجہ سے ہم غیروں کے ہاتھ میں ایک کھلونا بن کر رہ گئے ہیں۔ جبتک ہم "تقلید مغرب" کے اس زہریلے مادے کو جرأت کر کے ختم نہیں کریں گے اس وقت تک "اسرائیل" جیسے ناسور اٹھتے رہیں گے۔ اور وقتی تدبیریں ہمارے الجھے ہوئے مسائل کو حل نہیں کر سکیں گی۔

پچھلے دنوں مفتیٔ اعظم فلسطین نے راولپنڈی کی ایک تقریر میں کہا تھا کہ خلافتِ عثمانیہ کے زوال کے بعد عالم اسلام کی نگاہیں پاکستان کی طرف لگی ہوئی ہیں۔ اور دنیا بھر کے مسلمان پاکستان کو اپنی امنگوں اور آرزوؤں کا مرکز سمجھتے ہیں۔ اس لئے کہ یہ تنہا ایک ریاست ہے جو صرف اسلام کے نام پر قائم ہوئی ہے۔ مفتی صاحب کا یہ مطالعہ بالکل درست ہے، اور یہ پاکستان کے عوام اور حکام کا فریضہ ہے کہ وہ ماضی کے تلخ تجربات سے سبق لیکر دنیا بھر کے مسلمانوں کی ان توقعات کو پورا کریں، اور تقلید مغرب کے پامال راستے پر چلنے کی بجائے اپنے لئے اسلام کی بتائی ہوئی وہ راہیں اختیار کریں جو نہ صرف پاکستان کو صلاح و فلاح سے ہمکنار کرنے والی ہوں، بلکہ دوسرے اسلامی ممالک کو بھی موجودہ دلدل سے نکال کر امن و سکون عطا کر سکیں۔ ــــــــ وما علینا الا البلاغ

محمد تقی عثمانی

۲۴ر صفر المظفر ۱۳۸۸ھ

فلم خانۂ خدا — فوراً بند کیجئے

> ذیل میں معاصر موقر ہفت روزہ المنبر لائلپور کے ایک اداریہ کا اقتباس اپنی پوری تائید و حمایت کے ساتھ پیش خدمت کیا جا رہا ہے۔ امید ہے کہ ابھی ہم میں دھڑکتے ہوئے دل رکھنے والے کچھ مسلمان ایسے ضرور ہوں گے جو خانۂ خدا کی اس بے حرمتی کو روکنے کے لئے اپنی تمام امکانی کوششیں صرف کرنے سے دریغ نہیں کریں گے۔
>
> ادارہ

چند برسوں سے ہم نے دین کو اپنی خواہشات کے سانچے میں ڈھالنے کے لئے جو کوششیں شروع کر رکھی ہیں انھوں نے ہمیں خطرے کے نشان سے قریب تر کر دیا ہے اور اب ان دنوں ہم نے دین کو کھیل تماشہ بنانے کی حرکت "فلم خانہ خدا" کی صورت میں جو اقدام کیا ہے، اس نے یہ سگنل دیا ہے کہ تمہاری گاڑی، اب اس پل کو عبور کر رہی ہے جسے عبور کرنے کے تھوڑی ہی دور وہ گڑھا ہے جس میں گرنے والی کوئی قوم، اس سے باہر نہیں نکل سکی، اور اسے ہلاک ہونے سے اس کی دولت و ثروت اور اس کے وسائل و ذرائع نہیں بچا سکے۔

حج - ایک عبادت ہی نہیں، مال و جان، جسم و قلب اور ذہن و جذبات تمام انواع کی عبادتوں کا مجموعہ ہے۔

لیکن ہم نے، حج ایسی عبادت کو بھی لہو و لعب بنا کر رکھدیا۔ اور بیت اللہ کے گرد طواف، مقام ابراہیم پر سجدہ ہائے نیاز صفا اور مروہ میں عارفانہ سعی، منیٰ میں قربان گاہ خلیل پر ہدیۂ عقیدت کے اظہار، مزدلفہ اور عرفات میں محبت الٰہی میں سرمستی کے مناظر کو پردہ سکرین پر لا کر سینما بینوں کو یہ بتلا دیا ہے کہ (خاکم بدہن) "حج" بھی اسی طرح کا ایک "ناٹک" ہے جس طرح "راگ رنگ" اور "دل میرا دھڑکن تیری" قسم کی فحش انگیز فلموں کی کہانیاں ہیں۔

ہم متلاطم جذبات اور غضب الٰہی کا مشاہدہ کرنے والے دل کی تیز اور مضطربانہ دھڑکنوں کو دباتے ہوئے اور اس عالم ہوش ربا میں "عقل و استدلال" کو بروئے کار لاتے ہوئے عرض کرتے ہیں کہ طواف بیت اللہ میں عورتوں کے لئے پردہ واجب نہیں ہے۔ اور چار ہزار سالہ تاریخ شاہد ہے کہ اس رفع حجاب کی تلافی ہمیشہ بیت اللہ کی ہیبت و جلال سے ہوئی ہے اور ایک مرتبہ بھی عورت اور مرد کی یکجائی یہاں کوئی حادثہ پیدا نہیں کر سکی لیکن اگر بیت اللہ کے جلال اور قرب سے الگ کر کے طواف کی نمائش کی جائے اور اسی سینما ہال میں یہ "تماشہ" کیا جائے جہاں ہر لمحہ اغوا، زنا کی تعلیم و تربیت دی جاتی ہو تو اس کا نتیجہ اس کے سوا کیا برآمد ہو سکتا ہے کہ دیکھنے والے حج کو بھی وہی حیثیت دینے لگیں جو "قصر الحمرا" میں "ثقافتی شو" کو دی جاتی ہے اور ان "مخلوط اجتماعات" کے لئے استدلالی جواز مہیا کریں جو جنسی ہوس پورا کرنے کیلئے آرٹ گیلریوں میں منعقد کئے جاتے ہیں

معارف القرآن
حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب

حجر ۱۹ - تا - ۲۵

● ۔۔۔ ہمارے پاس ہر چیز کے خزانے ہیں
● ۔۔۔ آب رسانی کا قدرتی نظام
● ۔۔۔ آگے بڑھنے والے اور پیچھے رہنے والے

والارض مددناھا والقینا فیھا رواسی وانبتنا فیھا من کل شیٔ موزون ﴿۱۹﴾ وجعلنا لکم فیھا معایش ومن لستم لہ برازقین ﴿۲۰﴾ وان من شیٔ الا عندنا خزائنہ وما ننزلہ الا بقدر معلوم ﴿۲۱﴾ وارسلنا الریاح لواقح فانزلنا من السماء ماء فاسقینٰکموہ وما انتم لہ بخازنین ﴿۲۲﴾ وانا لنحن نحیی ونمیت ونحن الوارثون ﴿۲۳﴾ ولقد علمنا المستقدمین منکم ولقد علمنا المستاخرین ﴿۲۴﴾ وان ربک ھو یحشرھم انہ حکیم علیم ﴿۲۵﴾

خلاصہ تفسیر اور ہم نے زمین کو پھیلایا اور اس میں بھاری بھاری پہاڑ ڈال دیئے اور اس میں ہر قسم کی ضرورت کی پیداوار ایک معین مقدار سے اگائی اور ہم نے تمہارے واسطے زمین میں معاش کے سامان بنائے جس میں ضرورت زندگی کی تمام چیزیں داخل ہیں جو کھانے پینے پہننے اور رہنے سہنے سے متعلق ہیں۔ اور یہ سامان معاش اور ضروریات زندگی صرف تم کو ہی نہیں دیا۔ بلکہ ان کو بھی دیا جن کو تم روزی نہیں دیتے۔ یعنی وہ تمام مخلوقات جو ظاہر میں بھی تمہارے ہاتھ سے خورونوش اور زندگی گذارنے کا سامان نہیں پاتے۔ ظاہر اس لئے کہا کہ گھر کے پالتو جانور۔ بکری، گائے، بیل، گھوڑا گدھا وغیرہ بھی اگرچہ حقیقت کے اعتبار سے اپنی روزی اور ضروریات معاش حق تعالےٰ ہی کی طرف سے پاتے ہیں مگر ظاہر طور پر ان کے خورونوش اور رہائش کا انتظام انسانوں کے ہاتھوں ہوتا ہے۔ ان کے علاوہ تمام دنیا کے بری اور بحری پرندے اور درندے ایسے ہیں جن کے سامان معاش میں کسی انسانی ارادے اور عمل کا کوئی دخل اور شائبہ بھی نہیں پایا جاتا۔ اور یہ جانور اتنے بے حد و بیشمار ہیں کہ انسان نہ ان سب کو پہچان سکتا ہے نہ شمار کر سکتا ہے۔ اور جتنی چیزیں ضروریات زندگی سے متعلق ہیں ہمارے پاس سب کے خزانے بھرے پڑے ہیں اور ہم اپنی خاص حکمت کے مطابق اس چیز کو ایک معین مقدار سے اتارتے رہتے ہیں۔ اور ہم ہی ہواؤں کو بھیجتے رہتے ہیں جو کہ بادل کو پانی سے بھر دیتے ہیں پھر ہم آسمان سے پانی برساتے ہیں۔ پھر وہ پانی تم کو پینے کو دیتے ہیں۔ اور تم اس کو ذخیرہ کر کے رکھنے والے نہ تھے کہ اگلی بارش تک اس ذخیرہ کو استعمال کرتے رہتے۔ اور ہم ہی ہیں کہ زندہ کرتے ہیں اور سب کے مرنے کے بعد ہم ہی باقی رہ جاویں گے۔ اور ہم ہی جانتے ہیں تم میں سے آگے بڑھ جانے والوں کو اور ہم جانتے ہیں پیچھے رہنے والوں کو۔

احکام و معارف

حکمت الٰہیہ ضروریات معاش میں تناسب و موزونیت

من کل شیٔ موزون کا ایک مفہوم تو وہ ہی ہے جو ترجمہ میں لیا گیا ہے کہ بتقاضائے حکمت ہر اگنے والی چیز کی ایک مقدار معین اگائی جس سے کم ہو جاتی تو زندگی میں دشواریاں پیدا ہو جاتیں اور زیادہ ہو جاتی تو بھی مشکلات پیدا کرتی۔ انسانی ضرورت کے گندم اور چاول وغیرہ اور بہتر سے بہتر عمدہ پھل اگر اتنے زیادہ پیدا ہو جائیں جو انسانوں اور جانوروں کے کھانے پینے کے بعد بھی بہت بچ رہیں تو ظاہر ہے کہ وہ سڑیں گے اور ان کا رکھنا بھی مشکل ہوگا اور پھینکنے کے لئے جگہ بھی نہ رہے گی اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالٰے کی قدرت میں تو یہ بھی تھا کہ جن دانوں اور پھلوں پر انسان کی زندگی موقوف ہے ان کو اتنا زیادہ پیدا کر دیتے کہ ہر شخص کو ہر جگہ مفت مل جایا کرتے اور بیکری سے استعمال کرنے کے بعد بھی ان کے بڑے ذخیرے پڑے رہتے لیکن یہ انسان کے لئے عذاب ہو جاتا اس لئے ایک خاص مقدار میں نازل کئے گئے کہ ان کی قدر و قیمت بھی باقی رہے اور بیکار بھی نہ بچیں۔ اور من کل شیٔ موزون کا ایک مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تمام اگنے والی چیزوں کو اللہ تعالٰے نے ایک خاص تناسب اور موزونیت کے ساتھ پیدا کیا ہے جس سے اس میں حسن اور دلکشی پیدا ہوتی ہے۔ مختلف درختوں کے تنے، شاخیں، پتے، پھول اور پھل مختلف سائز مختلف شکل مختلف رنگ اور ذائقے کے پیدا کئے گئے، جس کے تناسب اور حسین منظر سے تو انسان فائدہ اٹھاتا ہے مگر ان کی تفصیلی حکمتوں کا ادراک کسی انسان کے بس کی بات نہیں۔

تمام مخلوق کے لئے آب رسانی اور آب پاشی کا عجیب و غریب نظام الٰہی

وارسلنا الریاح سے ماانتم لہ بخازنین تک قدرت الٰہیہ کے اس حکیمانہ نظام کی طرف اشارہ ہے جس کے ذریعہ روئے زمین پر بسنے والے تمام انسان اور جانور، چرندوں، پرندوں، درندوں کے لئے ضرورت کے مطابق آب رسانی کا ایسا نظام محکم قائم کیا گیا ہے کہ ہر شخص کو ہر جگہ ہر حال میں اپنی ضرورت کے مطابق پینے، نہانے، دھونے اور کھیتوں درختوں کو سیراب کرنے کے لئے پانی بلا کسی قیمت کے مل جاتا ہے اور جو کچھ کسی کو کنواں بنانے یا پائپ لگانے پر خرچ کرنا پڑتا ہے وہ اپنے سہولتیں حاصل کرنے کی قیمت ہے پانی کے ایک قطرہ کی قیمت بھی کوئی ادا نہیں کر سکتا نہ کسی سے مانگی جاتی ہے

اس آیت میں پہلے تو اس کا ذکر کیا گیا کہ کس طرح قدرت الٰہیہ نے سمندر کے پانی کو پوری زمین پر پہنچانے کا عجیب و غریب نظام بنایا ہے کہ سمندر میں بخارات پیدا فرمائے۔ جن سے بارش کا مواد (مان سون) پیدا ہوا اوپر سے ہوائیں چلائیں جو اس کو بادل کی شکل میں تبدیل کر کے پانی سے بھرے ہوئے پہاڑوں جیسے جہاز بنا دیں پھر پانی سے لبریز ان ہوائی جہازوں کو دنیا کے ہر گوشہ میں جہاں جہاں پہنچانا ہے پہنچا دیں، پھر فرمان الٰہی کے تابع جس زمین پر جتنا پانی ڈالنے کا حکم ہے اس کے مطابق یہ خودکار ہوائی جہاز وہاں پانی برسا دیں۔

اس طرح یہ سمندر کا پانی زمین کے ہر گوشے میں بسنے والے انسانوں اور جانوروں کو گھر بیٹھے مل جائے اسی نظام میں ایک عجیب و غریب تبدیلی پانی کے ذائقے اور دوسری کیفیات میں پیدا کر دی جاتی ہے کیونکہ سمندر کے پانی کو اللہ تعالٰے نے اپنی حکمت بالغہ سے انتہائی کھارا اور ایسا نمکین بنایا ہے کہ ہزاروں ٹن نمک اس سے نکالا اور استعمال کیا جاتا ہے۔ حکمت اس میں یہ ہے کہ یہ عظیم الشان پانی کا کرہ جس میں کروڑوں قسم کے جانور رہتے اور اسی میں مرتے اور سڑتے ہیں اور ساری زمین کا گندہ پانی بالآخر اسی میں جا کر پڑتا ہے اگر یہ پانی میٹھا ہوتا تو ایک دن میں سڑ جاتا اور اس کی بدبو اتنی شدید ہوتی کہ خشکی میں رہنے والوں کی تندرستی اور زندگی مشکل ہو جاتی۔ اس لئے قدرت نے اس کو ایسا تیزابی کھارا بنا دیا کہ دنیا بھر کی غلاظتیں اس میں پہنچکر بھسم ہو جاتی ہیں۔ غرض

اس حکمت کی بنا پر سمندر کا پانی کھاری بلکہ تلخ بنایا گیا جو نہ پیا جا سکتا ہے نہ اس سے پیاس بجھ سکتی ہے۔ نظام قدرت نے جو پانی کے ہوا جہاز بادلوں کی شکل میں تیار کئے ان کو صرف سمندری پانی کا خزانہ ہی نہیں بنایا بلکہ مان سون اٹھنے سے لے کر زمین پر برسنے تک اس میں ایسے انقلابات بغیر کسی ظاہری مشین کے پیدا کر دیئے کہ اس پانی کا نمک علیحدہ ہو کر میٹھا پانی بن گیا۔ سورۂ مرسلات میں اس کی طرف اشارہ فرمایا ہے واسقیناکم ماء فراتا اس میں لفظ فرات کے معنی ہیں ایسا میٹھا پانی جس سے پیاس بجھے۔ معنی یہ ہیں کہ ہم نے بادلوں کی قدرتی مشینوں سے گذار کر سمندر کے کھاری اور تلخ پانی کو تمہارے پینے کے لئے شیریں بنا دیا۔ سورۂ واقعہ میں اسی مضمون کو ارشاد فرمایا۔

افرأیتم الماء الذی تشربون ء انتم انزلتموہ من المزن ام نحن المنزلون ○ لو نشاء جعلناہ اجاجا فلو لا تشکرون

(ترجمہ) بھلا دیکھو تو پانی کو جو تم پیتے ہو کیا تم نے اتارا اس کو بادل سے یا ہم ہیں اتارنے والے اگر ہم چاہیں کر دیں اس کو کھارا پھر کیوں نہیں احسان مانتے

یہاں تک تو قدرت الہیہ کی یہ کرشمہ سازی دیکھی کہ سمندر کے پانی کو میٹھے پانی میں تبدیل کر کے پوری روئے زمین پر بادلوں کے ذریعے کس حسن نظام کے ساتھ پہنچایا کہ ہر خطہ کے نہ صرف انسانوں کو بلکہ ان جانوروں کو بھی جو انسانوں کی دریافت سے باہر ہیں گھر بیٹھے پانی پہنچا دیا۔ اور بالکل مفت بلکہ جبری طور پر پہنچا دیا۔

لیکن انسان اور جانوروں کا مسئلہ صرف اتنی بات سے حل نہیں ہو جاتا۔ کیونکہ پانی ان کی ایسی ضرورت ہے جس کی احتیاج ہر روز بلکہ ہر آن ہے۔ اس لئے ان کی ضرورت روزمرہ کو پورا کرنے کا ایک طریقہ تو یہ تھا کہ ہر جگہ سال کے بارہ مہینے ہر روز بارش ہوا کرتی لیکن اس صورت میں ان کی پانی کی ضرورت تو رفع ہو جاتی مگر دوسری معاشی ضروریات میں کتنا خلل آتا اس کا اندازہ کسی اہل تجربہ کے لئے مشکل نہیں۔ سال بھر کے ہر دن کی بارش تندرستی پر کیا اثر ڈالتی اور کاروبار اور نقل و حرکت میں کیا تعطل پیدا کرتی۔

دوسرا طریقہ یہ تھا کہ سال بھر کے خاص خاص مہینوں میں اتنی بارش ہو جائے کہ جس کا پانی باقی مہینوں کے لئے کافی ہو جائے مگر اس کے لئے ضرورت ہوتی کہ ہر شخص کا ایک کوٹہ مقرر کر کے اس کے سپرد کیا جائے وہ اپنے کوٹہ اور حصے کا پانی خود اپنی حفاظت میں رکھے۔

اندازہ لگائیے کہ اگر ایسا کیا جاتا تو ہر انسان اتنی ٹنکیاں یا برتن وغیرہ کہاں سے لاتا۔ جن میں تین یا چھ مہینے کی ضرورت کا پانی جمع کر کے رکھ لے۔ اور اگر وہ کسی طرح ایسا کر بھی لیتا تو ظاہر ہے کہ چند روز کے بعد یہ پانی سڑ جاتا اور پینے بلکہ استعمال کرنے کے بھی قابل نہ رہتا۔ اس لئے قدرت الہیہ نے اس کے باقی رکھنے اور بوقت ضرورت ہر جگہ مل جانے کا ایک دوسرا عجیب و غریب نظام بنایا۔ کہ جو پانی برسایا جاتا ہے اس کا کچھ حصہ تو فوری طور پر درختوں کھیتوں اور انسانوں جانوروں کو سیراب کرنے میں کام آ ہی جاتا ہے کچھ کھلے تالابوں جھیلوں میں محفوظ ہو جاتا ہے اور اس کے بہت بڑے حصہ کو برف کی شکل میں بحر منجمد بنا کر پہاڑوں کی چوٹیوں پر لاد دیا جاتا ہے جہاں تک نہ گرد و غبار کی رسائی ہے نہ کسی غلاظت کی۔

پھر اگر وہ پانی کی سیال صورت میں رہتا تو ہوا کے ذریعہ کچھ گرد و غبار یا دوسری خراب چیزیں اس میں پہنچ جانے کا خطرہ رہتا۔ پرندے جانوروں کے اس میں گرنے پڑنے کا اندیشہ رہتا جس سے وہ پانی خراب ہو جاتا۔ مگر قدرت نے اس پانی کے عظیم خزانے کو بحر منجمد بنا کر پہاڑوں پر لاد دیا جہاں سے تھوڑا تھوڑا رس کر وہ پہاڑوں کی رگوں میں پیوست ہو جاتا اور پھر چشموں کی صورت میں ہر جگہ پہنچ جاتا ہے۔

اور جہاں یہ چشمے بھی نہیں ہیں تو وہاں زمین کی تہ میں یہ پانی انسانی رگوں کی طرح زمین کے ہر خطہ پر بہتا ہوا اور کنواں کھودنے سے برآمد ہونے لگتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ آب رسانی کا یہ نظام الٰہی ہزاروں نعمتیں اپنے اندر لئے ہوئے ہے۔ اول تو پانی کو پیدا کرنا ایک بڑی نعمت ہے پھر بادلوں کے ذریعہ اس کو زمین کے ہر خطہ پر پہنچانا دوسری نعمت ہے پھر اس کو انسان کے پینے کے قابل بنادینا تیسری نعمت ہے پھر انسان کو اس کے پینے کا موقع دینا چوتھی نعمت ہے پھر اس پانی کو ضرورت کے مطابق جمع اور محفوظ رکھنے کا نظام محکم پانچویں نعمت ہے۔ پھر انسان کو اس سے پینے اور سیراب ہونے کا موقع دینا چھٹی نعمت ہے کیونکہ پانی کے موجود ہوتے ہوئے بھی ایسی آفتیں ہو سکتی ہیں کہ ان کی وجہ سے آدمی پینے پر قادر نہ ہو۔ قرآن کریم کی آیت فاسقیناکموہ وما انتم لہ بخازنین ۰ میں انہیں نعماء الٰہیہ کی طرف اشارہ اور تنبیہ کی گئی ہے۔ فتبارک اللہ احسن الخالقین

نیک کاموں میں آگے بڑھنے اور پیچھے رہنے میں درجات کا فرق

ولقد علمنا المستقدمین منکم والمستاخرین

میں مستقدمین اور مستاخرین کی تفسیر میں ائمہ صحابہ وتابعین سے مختلف منقول ہیں۔ مستقدمین وہ لوگ جو اب تک پیدا ہو چکے ہیں اور مستاخرین وہ جو ابھی تک پیدا نہیں ہوئے (قتادہ عکرمہ) مستقدمین سے مراد اموات ہیں اور مستاخرین سے وہ لوگ جواب زندہ ہیں (ابن عباس وضحاک) مستقدمین سے مراد امت محمدیہ سے پہلے حضرات ہیں اور مستاخرین سے امت محمدیہ (مجاہد) مستقدمین اہل طاعت وخیر ہیں اور مستاخرین اہل معصیۃ وغفلت (حسن وقتادہ) مستقدمین وہ لوگ ہیں جو نماز کی صفوف یا جہاد کی صفوف اور دوسرے نیک کاموں میں آگے رہنے والے ہیں اور مستاخرین وہ جو ان چیزوں میں پچھلی صفوں میں رہنے والے ہیں۔ حسن بصری سعید بن مسیب۔ قرطبی شعبی وغیرہ ائمہ تفسیر کی یہی تفسیر ہے۔ اور ظاہر ہے کہ درحقیقت ان اقوال میں کوئی خاص اختلاف نہیں سب جمع ہو سکتے ہیں کیونکہ اللہ جل شانہ کا علم محیط ان تمام اقوال کے

قرطبی نے اپنی تفسیر میں فرمایا کہ اس آیت سے نماز میں صف اول اور شروع وقت میں نماز ادا کرنے کی فضیلت ثابت ہوتی ہے، جیسا کہ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر لوگوں کو معلوم ہو جاتا کہ اذان کہنے اور نماز کی صف اول میں کھڑے ہونے کی کتنی فضیلت ہے تو تمام آدمی اس کی کوشش میں لگ جاتے کہ پہلی ہی صف میں کھڑے ہوں اور سب کے لئے جگہ نہ ہوتی تو قرعہ اندازی کرنا پڑتی۔

قرطبی نے اس کے ساتھ حضرت کعب کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ اس امت میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں کہ جب وہ سجدے میں جاتے ہیں تو جتنے آدمی اس کے پیچھے ہیں سب کی مغفرت ہو جاتی ہے، اسی لئے حضرت کعب آخری صف میں رہنا پسند کرتے تھے کہ شاید اگلی صفوف میں کوئی اللہ کا بندہ ایسی شان کا ہو تو اس کی برکت سے میری مغفرت ہو جائے۔ انتہیٰ کلامہ:

اور ظاہر یہ ہے کہ اصل فضیلت تو صف اول ہی میں ہے جیسا کہ آیت قرآن اور حدیث کی تصریحات سے ثابت ہوا لیکن جس شخص کو کسی وجہ سے صف اول میں جگہ نہ ملی تو اس کو بھی ایک گونہ فضیلت یہ حاصل رہے گی کہ شاید اگلی صفوف کے کسی نیک بندے کی بدولت اس کی بھی مغفرت ہو جائے۔

اور آیت مذکورہ میں جیسے نماز کی صف اول کی فضیلت ثابت ہوئی اسی طرح جہاد کی صف اول کی فضیلت بھی ثابت ہو گئی۔

شیطانی نعرہ

اکبر الٰہ آبادی

ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب

ایلاف

جاہلیت میں عربوں کے معاشی و سفارتی تعلقات

کلیۂ ادبیات، جامعہ استانبول
عرصہ ہوا سورۂ ایلاف کی تفسیر میں نے فرانسیسی میں شائع کی تھی، اب اس کا اردو ترجمہ جو میں نے ہی کیا ہے، کراچی کے موقر رسالہ "البلاغ" کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں تاکہ اگر پسند آئے تو شائع فرما دیں۔ —— محمد حمید اللہ ۲۴ ذی الحجہ ۸۸ھ

شہر مکہ کی تاسیس اور آغاز

اہل مکہ کی روایتیں کہتی ہیں کہ اس شہر کا آغاز حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ہوا، جو تقریباً اٹھارہ سو سال قبل مسیح پیدا ہوئے تھے۔ شخصی اسباب کی بنا پر حضرت ابراہیمؑ نے اپنی بیوی ہاجرہؑ اور دودھ پیتے بچے اسماعیلؑ کو وادی بکّہ (قرآن سورہ ۳، آیت ۹۶) میں لا چھوڑا اور وہیں رفتہ رفتہ شہر مکہ آباد ہوا، یہ مقام اس وقت غیر آباد تو رہا ہو سکتا ہے لیکن قطعاً بے آب و گیاہ اور ناقابل رہائش بہر حال نہ تھا (سیرۃ ابن ہشام، طبع یورپ، صفحہ ۷۱-۷۲) غیر آباد ہونے کے باعث وہاں زراعت نہ ہوتی تھی (قرآن کریم سورہ ۱۴، آیت ۳۷: "وادٍ غیر ذی زرع") مگر حضرت ابراہیمؑ کو وہاں آبادی کے امکانات اور انسانی زندگی کے ضروری عناصر نظر آئے ہوں گے۔ جبھی تو انھوں نے (مکہ کی قدیم ترین تحریری تاریخی دستاویز یعنی قرآن مجید سورہ ۱۴، آیت ۳۵ تا ۳۷، نیز سورہ ۲، آیت ۱۲۶ کے مطابق) دعا فرمائی۔

"اور جب ابراہیم نے کہا: اے میرے رب، اس مقام کو پُر امن بنا، اور مجھے اور میرے بچوں کو بت پرستی سے بچا... اے میرے رب میں نے اپنی نسل کے ایک حصے کو ایک زراعت سے خالی وادی میں لا بسایا ہے جو تیرے حرام بنائے ہوئے گھر کے پاس ہے، تاکہ اے ہمارے رب وہ نماز قائم کریں پس ایسا کر کہ لوگوں کے دل ان کی طرف مائل ہوں اور انھیں میووں کا رزق عطا فرما، شاید وہ شکر ادا کیا کریں گے۔"

عربی ماخذوں سے پتہ چلتا ہے کہ اس وادی بکّہ کے آس پاس کے علاقے میں عرب باشندے خانہ بدوش ہی بھی رہتے تھے ان کا تعلق بڑے اور طاقتور قبیلہ عمالقہ سے تھا جیسا کہ ابن ہشام صفحہ ۷۹ نے ابن الزبعری کی بیت کو نقل کرتے ہوئے بتایا ہے، نیز دیکھو سہیلی کی الروض الانف جلد اول صفحہ ۵۱) یہ وہی عمالقہ ہیں جن کی ایک شاخ حضرت موسیٰؑ کے مصر سے خروج سے قبل فلسطین میں بس چکی تھی یہودیوں نے ان کو وہاں سے نکال کر خود بسنا چاہا، عمالقہ[1] نے حفاظت ذاتی میں مقاومت کی۔

---

[1] عمالقہ اور بنی اسرائیل کی جنگ کی یہ توجیہ قرآن کریم ...... کے مجوزہ اسلوب بیان کے پیش نظر بہت قابل غور ہے اگر خود ڈاکٹر صاحب یا علیم یا کوئی اور صاحب علم ایک تحقیقی مقالے کے ذریعے اس بات کی مکمل وضاحت فرمائیں تو ادارہ البلاغ ممنون ہوگا —— مدیر

اس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد کے یہودیوں نے ان بیچاروں کو بائبل میں جتنا کوسا اور بدنام کیا ہے اور ان کو اور انکی عورت بچوں اور شیرخواروں ہی کو نہیں جانوروں تک کو جس بے دردی سے نیست و نابود کرنے کا حکم دیا ہے (دیکھو توریت کی کتاب تثنیہ جو حضرت موسیٰؑ کے کئی سو سال بعد کی تالیف ہے، باب ۲۰ جملہ ۱۶، نیز اشموئیل اول ۳/۱۵) وہ انسانی تاریخ کا سب سے شرمناک واقعہ کہا جا سکتا ہے لیکن اس سے ہمیں یہاں بحث نہیں۔

مذکورہ عربی ماخذوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جنوبی عرب کے قبائل میں سے ایک یعنی جرہم کے کچھ لوگ وادیٔ مکہ میں سے گزرے اور وہاں پینے کا پانی افراط سے چشمے کی صورت میں دیکھا —— جواب زمزم کا کنواں بن گیا ہے —— نیز ایک جنگل موجود پایا (ابن ہشام صفحہ ۷۱ - ۷۲) اور ممکن ہے جانوروں کے لئے چراگاہ بھی پائی ہو، اس پر وہ وہیں ٹھیر گیا۔ اگر حضرت ہاجرہ کو اپنی تنہائی میں اس قبیلے کی آمد غنیمت معلوم ہوئی تو جرہمیوں کو بھی چشمے کی مالک حضرت ہاجرہ نے وہاں بسنے کی اجازت دی تو شکر گذاری محسوس ہوئی، چنانچہ انھوں نے بی بی اور ان کے ننھے بچے کو اپنی حفاظت اور مہمان نوازی میں لے لیا، جرہمیوں کے دوسرے رشتہ دار خاندان بھی رفتہ رفتہ وہاں آکر بسے۔ اور بستی وفاقی دستور کا ایک شہر یا ایک شہری مملکت بن گئی۔ اس لامرکزیت کی وجہ یہ ہوئی کہ ان کنبوں میں اس بات پر اتفاق نہ ہو سکا کہ شہری زندگی سب لوگ ایک ہی ادارے کے تحت گزاریں۔ ابن ہشام (حوالۂ بالا) کے مطابق جُرہُم قبیلہ اپنے سردار مُضاض بن عَمرو کے ساتھ مَعلات (بالائی رقبے) میں بسا اور ان کا رشتہ دار قبیلہ قطورا، جس کا سردار سَمیدع تھا مَسفَلہ (زیریں رقبے) میں قیام پذیر ہوا۔ جو کوئی شمالی راستے سے شہر میں آتا تو اس سے مُضاض عُشر (چنگی) وصول کرتا اور جو جنوبی راستے سے آتا وہ عُشر سَمیدع کو ادا کرتا، کچھ عرصہ بعد ان دونوں قبیلوں میں برادرکشی اور جنگ کا بھی پتہ چلتا ہے جس پر کسی کو حیرت نہ ہونی چاہئے۔

مگر اتنے قدیم عہد میں اس شہری مملکت کے "سفارتی" تعلقات کے سلسلے میں معلومات اور تفصیلوں کی تلاش بے سود ہوگی۔

جو بھی ہو، کہتے ہیں چند سال بعد حضرت ابراہیمؑ وہاں دوبارہ آئے، تاکہ اپنے بیٹے اسماعیلؑ کو جواب ایک نوجوان لڑکا تھا، دیکھیں۔ قرآن مجید (سورہ ۲، آیت ۱۲۷ و مابعد) کی شہادت کے مطابق حضرت اسماعیلؑ کی مدد سے حضرت ابراہیمؑ نے وہاں ایک عبادت گاہ تعمیر کی۔ یہ ایک سادہ مکعب کوٹھری تھی، جواب کعبے کے نام سے مشہور ہے اسے آپ نے "بیت اللہ" کا نام دے کر خدائے واحد کی عبادت سے مخصوص کیا، قرآن مجید (سورہ ۳، آیت ۹۶) نے اسے "اول بیت وُضِعَ للناس" (پہلا گھر جو لوگوں کے لئے بنایا گیا) قرار دیا ہے، اور یہ بیت المقدس سے کہیں قدیم تر ہے (جسے حضرت سلیمانؑ نے بنایا) حضرت ابراہیمؑ نے کعبے کے سلسلے میں حج کا بھی حکم دیا کہ لوگ ہر سال عبادت کے لئے اس کی زیارت کو آئیں۔ آس پاس کے لوگ بھی وہاں کشاں کشاں آنے لگے (کوئی عبادت کیلئے تو کوئی تجارت کے لئے)، اور اس طرح شہر کی اہمیت روز بروز بڑھتی ہی گئی۔

اس کا سلسلہ صدیوں جاری رہا، اس اثنا میں بڑے بھی وہاں آکر ادب سے سر جھکاتے رہے چھوٹے بھی۔ اگر وہاں عرب کے مختلف علاقوں کے "بادشاہ" نظر آتے ہیں تو اجنبی بھی ملتے ہیں، عرب مورخوں (شرح بخاری للعینی ج ۷، ص ۳۶۵، نیز اخبار مکہ للازرقی، و کتاب التیجان لابن ہشام، برموقع) کو یقین ہے ان اجنبی زائروں میں اف[illegible] خیر بادشاہ ذوالقرنین (یعنی دو سینگوں والا) بھی شامل [illegible] اگر اس سے مراد سکندر اعظم ہے تو یونانی تاریخوں میں [illegible] ملتا ہے، اگرچہ اس کا مصر سے ہندوستان جاتے ہوئے

گرد رنا ناممکن نہیں، خاص کر اس بت پرست اور اوہام پسند بادشاہ کے لئے مکے کی عبادت گاہ اتنی مشہور تھی کہ پرانی یونانی جغرافیہ نگار بھی اس کا ذکر کرتے ہیں۔ مثلاً بطلیموس (جغرافیہ کتاب ۶، باب ۷، فصل ۳۲) اس کو مقربہ (MACORABA) کے نام سے یاد کرتا ہے۔ خوری حِتّی (کی انگریزی ہسٹری آف دی عربس، طبع ۱۹۵۱ء ص ۱۰۳ میں) لکھا ہے، سبائی زبان میں اس لفظ کے معنے عبادت گاہ کے ہیں (غالباً اس لفظ کو عربی لفظ مَقْرَب سے ربط ہے جو قربَ اور قربان گاہ کے معنے رکھتا ہے یعنی بھینٹ چڑھانے کی جگہ: کعبے کے پاس ایسا ہوا بھی کرتا تھا) اس سے اس روایت کی توثیق ہوتی ہے کہ یمنی قبیلہ جُرہُم نے حضرت ابراہیمؑ و اسماعیلؑ کے زمانہ میں مکہ آباد کیا تھا، جہاں تک ذوالقرنین کا تعلق ہے مقدونیہ والا سکندر اعظم ایک مینڈھے کی پوجا کیا کرتا تھا اور اس کی سینگیں بطور علامت کے ٹوپی پر لگا کر پہنتا تھا، یہ رواج مقدونیہ (یوگوسلاویہ) میں اب تک رہا ہے اور وہاں کے حکمران عیسائیت کے باوجود دو سینگوں والے ٹوپی درباری مراسم کے وقت پہنتے رہے ہیں، عربوں نے سکندر اعظم اور اس کے ساتھیوں کو اس لباس میں دیکھا تو ذوالقرنین سے بہتر نام اسے اور کیا دیا جا سکتا ہے! مصر میں سکندر اعظم کے جو کتبے ہیں ان سے اس لباس اور اس کے مفہوم کی پوری توثیق ہوتی ہے۔ عبدالمطلب کے زمانہ میں کعبے کی آرائش جن قدیم اور قیمتی چڑھاووں سے کی جاتی تھی ان میں دو سینگوں والے سنہری کبش (مینڈھے) کے سر کا بھی ذکر آتا ہے (اخبار مکہ للازرقی، ص ۱۱۱، سنن ابی داؤد، ۹۵/۱۱)

معلوم نہیں ایرانی بادشاہ ساسان کبھی شخصاً مکہ آیا تھا یا نہیں، مگر سُہیلی (الروض الانف ۹۷/۱) نے لکھا ہے کہ جب خزاعہ قبیلے نے حملہ آوری کر کے جُرہُم کو مکہ سے نکال باہر کیا تو جرہمیوں نے کعبے کے چڑھاووں کا خزانہ زمزم کے کنوئیں میں ڈال کر اسے پاٹ دیا تھا، عبدالمطلب نے جب زمزم کا خواب میں نشان پا کر اس کو دوبارہ کھودا تو اندر سے خزانہ بھی برآمد ہوا، اس میں دو سنہری ہرنیں اور چند "قلعی" تلواریں بھی تھیں جو ایرانیوں کے بادشاہ ساسان نے کعبہ کو تحفہ دی تھیں۔ بعض روایتوں میں یہ بادشاہ شاہپور کی فرستادہ چیزیں [illegible]

مختلف خانوادے

جرہمیوں کے علاوہ جن کا اوپر ذکر آیا مورخوں کا بیان ہے کہ کچھ عرصہ قبیلہ ایاد نے بھی حکمرانی کی ہے (انساب الاشراف للبلاذری جلد اول، ص ۵۱) پھر انھوں نے خزاعہ قبیلے کے لئے اپنی جگہ خالی کی۔ اس عہد کے متعلق زیادہ حالات معلوم نہیں، لیکن جب حضرت اسمٰعیلؑ کی اولاد میں سے قُصَیؒ نے خزاعی سردار کی بیٹی سے نکاح کیا تو یہ ایک تاریخی زمانے سے تعلق رکھتا ہے جس کا ٹھیک عصر بھی معین کیا جا سکتا ہے۔ خسر کے انتقال پر قُصَی نے وہاں سرداری حاصل کر لی۔ قُصَی کی ماں شمالی عرب کے قبیلہ قضاعہ سے تعلق رکھتی تھی، ابن حبیب (کتاب المنمق، طبع حیدرآباد دکن، ص ۲۷۶) کا بیان ہے اس تبدیلِ حکومت کے زمانے میں قضاعہ اور ان کے حلیف اسد کے قبیلوں نے مسلح فوج بھیجکر قصی کی حمایت کی تھی۔ ابن حبیب کے شاگرد ابن قُتَیبہ (کتاب المعارف، طبع یورپ، ص ۳۱۳) کے مطابق تو قیصر روم (بیزنطینی حکمران) نے قصی کی مدد کی تھی۔ اس زمانے میں پہلا تھیودوسس (۳۷۹ تا ۳۹۵ء) بادشاہ تھا۔ اس زمانہ میں رومی سلطنت کے دو ٹکڑے ہو گئے تھے اور قسطنطنیہ کے مشرقی رومیوں (بیزنطینیوں) نے روما کے مغربی رومیوں سے خود مختاری اختیار کر لی تھی، ممکن ہے قصی کی مدد سے تھیوڈوس کا منشا اپنے اقتدار کو مضبوط تر بلکہ وسیع تر کرنا بھی ہو۔

جو بھی ہوا ہو، قصی نے بلدی زندگی کی نئی تنظیم کی اور مکے کی شہری مملکت میں متعدد ادارے کارفرمائی کرنے لگے جن میں سے بعض صراحت کے ساتھ قصی کی ایجاد ہونا بتائے گئے ہیں۔ (مثلاً باشندوں پر رِفادہ کے نام سے ایک سالانہ ٹیکس [illegible]

مکے کی حکومت ہر دیگر ملک کی طرح مکے کی شہری مملکت بھی خود مختار تھی اور اندرونی اور بیرونی ہر امر میں اقتدار اعلیٰ سے بہرہ ور تھی۔ چنانچہ وہ اجنبیوں سے معاہدے کر سکتی اور کسی اور اجنبی اقتدار کی ماتحتی کے بغیر ان سے امن یا جنگ کے تعلقات رکھ سکتی تھی۔

ہم یہاں صرف سفارتی اور اجنبی تعلقات سے بحث پر اکتفا کریں گے۔ اس سلسلے میں وہاں ایک موروثی عہدہ دار (وزیر) "سفیر و مُنافر" کے نام سے پایا جاتا تھا۔ اس کا پتہ نہیں چلتا تھا کہ کس تاریخ سے اس ادارے کا آغاز ہوا، لیکن زمانۂ ماقبل اسلام کے متعلق پرانے مورخوں نے بعض معلومات محفوظ رکھی ہیں۔ چنانچہ ابن عبدربہ (فوت ۳۲۸ھ / ۹۴۰ء) نے العقد الفرید (طبع بولاق ۱۲۹۳ھ، جلد دوم ص ۴۶) میں اور المقریزی (ف ۸۴۵ھ / ۱۴۴۲ء) نے الخبر عن البشر (مخطوطۂ مصر جلد چہارم، ص ۸۸ تا ۹۰) میں — اور ان میں سے اول الذکر نے ابن الکلبی کے حوالے سے — بیان کیا ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں مکے میں اعیانی حکومت تھی جس میں دس موروثی سرداروں کی مجلس کارفرمائی کرتی تھی، "وزیر خارجہ کا ذکر کرتے ہوئے یہ مورخ لکھتے ہیں کہ اگر کوئی جنگ چھڑتی تو (حضرت) عمر بن الخطاب کو سفیر بنا کر بھیجا جاتا، اگر کسی اور قبیلہ سے فضیلت اور برتری منانے کے لئے منافرت کی ضرورت پیش آتی تو اس کے لئے بھی قریش عمر بن الخطاب کو اپنا مُنافر بنا کر بھیجتے اور یہ نمائندہ جو بھی کہتا قریش اسے قبول کر لیتے"۔

سارے مؤلف اس پر متفق ہیں کہ اس مجلس حکومت میں دس افسر ہوا کرتے، یہ کہ اسلام کی آمد تک اس کا سلسلہ جاری رہا اور یہ کہ سفیر و منافر کے عہدے پر اسلام سے عین ماقبل حضرت عمر مامور تھے۔

الازرقی نے اپنی مشہور تاریخ (اخبار مکہ، طبع یوروپ ص ۱۰۷) میں بیرونی تعلقات کے متعلق ایک اور واقعہ کا ذکر کیا ہے۔ وہ یہ کہ ایک مرتبہ خانۂ کعبہ میں آگ لگی جس سے دیواریں کمزور ہو گئیں، پھر جب ایک موسلا دھار بارش ہوئی تو دیواریں گر پڑیں اور دوبارہ تعمیر کی ضرورت پیش آئی، اس طوفان سے سمندر بھی محفوظ نہ رہا اور ایک رومی (بیزنطینی) جہاز جو سامان لے کر (مصر سے) یمن جا رہا تھا، شُعیبہ (موجودہ جدہ) کے سامنے خشکی پر چڑھ گیا، خبر ملی تو مکے والے وہاں گئے اور جہاز کا جو سامان بچ سکا تھا خاص کر لکڑی کے تختے خرید لئے اور جہاز والوں کو اجازت دی کہ مکہ آئیں اور بچا کھچا سامان وہاں بیچیں اور انہیں عُشر (محصول درآمد) بھی معاف کر دیا، ورنہ عادت یہ تھی کہ رومی تاجر مکہ آتے تو ان سے وہاں عُشر (دس فیصد چنگی) وصول کیا جائے جس طرح کہ رومی اپنے علاقہ میں مکی تاجروں سے وصول کرتے تھے"۔ یہ ۶۰۵ء کا واقعہ ہے جبکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر پینتیس ۳۵ سال کی تھی اور اس میں شبہ نہیں کہ: مکی قانون بین الممالک کا خاصا قدیم قاعدہ تھا۔

یہاں ایک اور واقعے کی ذکر کیا جا سکتا ہے جسے کسی قدر اہمیت حاصل ہے، وہ یہ کہ قدیم زمانہ میں مکہ مشرق و مغرب کی بین الممالک تجارت کی شاہراہ پر واقع تھا۔ یمن بلکہ خود ہندستان کی پیداوار شام اور قسطنطنیہ جانے کے لئے مکے سے گذرتی تھی۔ اس عبور و مرور کے لئے ہر مقام (بشمول مکہ) کے لوگوں کی اجازت ناگزیر تھی اسی طرح عرب بھی (بشمول اہل مکہ) تجارت کے لئے بیرونی ممالک کا سفر کیا کرتے تھے، اور سربرآوردہ لوگ جہاں بھی جاتے وہاں کے اعلیٰ افسروں سے ضرور ملتے تھے۔ خاص کر شاعر بادشاہوں کے دربار میں حاضر ہوتے اور مدح و ستائش کے قصیدے گاتے۔ ابن عبدربہ وغیرہ کی کتابوں میں "وفادات" پر مستقل باب ہی ہیں کہ کس طرح مختلف عرب افراد بیرونی حکمرانوں کے ہاں باریاب ہوتے رہے۔ اس سلسلے میں مکہ کے سربرآوردہ لوگ حبش کے نجاشی، فارس کے کسریٰ، مصر کے گورنر، یمن، غسان (شام) اور حیرہ (عراق) کے بادشاہوں وغیرہ کے ہاں حاضر ہوتے نظر آتے ہیں۔

اس طرح کی ایک سفارت قبل اسلام کی عربی تاریخ میں

بڑی مشہور ہے۔ اسے ایلاف کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ اس موضوع پر کثیر مواد کے باوجود، مشرق میں ہو کہ مغرب میں، کسی نے اب تک توجہ نہیں کی یہاں اسی کا کچھ ذکر مطلوب ہے

ایلاف

سب سے پہلے یہ یاد دلانا ہے کہ قرآن مجید میں ایک چھوٹا لیکن پورے کا پورا سورہ اس موضوع پر ہے جسے کبھی سورۂ قریش اور کبھی سورۂ ایلاف کا نام دیا جاتا ہے۔ اس کا ترجمہ درج ذیل ہے۔

رحمان اور رحیم اللہ کے نام سے!

۱۔ قریش کے "ایلاف" کے باعث،

۲۔ ان کے "ایلاف" کے باعث سرما اور گرما کا کارواں چلتا ہے۔

۳۔ پس چاہئے کہ وہ اس گھر (کعبہ) کے آقا کی عبادت کریں۔

۴۔ جس نے بھوک پر انہیں کھانا کھلایا۔

۵۔ اور خوف پر انہیں امن مہیا کیا ہے۔

(سورہ ۱۰۶، آیات ۱ تا ۵)

سورے میں مذکورہ اس "ایلاف" سے کیا مراد ہے؟ اولاً ایک پرانے واقف کار مورخ ابن حبیب (فوت ۲۴۵ھ) کی طرف رجوع کریں، وہ اپنی کتاب المحبّر، ص ۱۶۲ میں) بیان کرتا ہے کہ "الایلاف العہود" یعنی ایلاف کے معنی معاہدوں کے ہیں)، سہیلی نے (اپنی سیرت نبوی الروض الانف ۱/۴۸ میں) اس کی تائید کی ہے، اور مختلف شواہد سے استناد کیا ہے۔ لغت نویسوں کو بھی اس سے انکار نہیں۔ ایلاف کا مادہ "الف" الفت اور دوستی کے معنے رکھتا ہے اور اس کا فعل متعدی یعنی ایلاف دوستی کرانے، اور الفت پیدا کرنے کے معنے رکھ سکتا ہے لسان العرب اور تاج العروس جیسی بڑی اور مستند لغتوں میں وہ الف کے تحت مزید برآں یہ بھی صراحت ہے کہ "قرآن مجید میں آئے ہوئے لفظ ایلاف کے معنے معاہدوں اور سمجھوتوں کے ہیں" لیکن بطور اسم عَلَم کے ایلاف کا اطلاق ان معاہدوں پر ہوتا ہے جو چند سربرآوردہ اہل مکہ نے ہمسایہ حکمرانوں سے طے کیا تھا جن کی تفصیل نیچے آتی ہے) ایلاف کے اس مفہوم کی مزید توثیق اس طرح بھی ہوتی ہے کہ ان ایلاف نامی معاہدوں کو بعض مورخوں نے عِصَم اور عہود کے نام سے بھی اپنی کتابوں میں ذکر کیا ہے۔ ان الفاظ کے بھی معنے ہیں معاہدے، یا اطمینان دہانیاں۔

ان معاہدوں کا قصہ

تاریخ یعقوبی (۱/۲۰۰ تا ۲۰۲) میں لکھا ہے: اہل مکہ مصیبت زدہ تھے اور ان کے تاجروں کا کاروبار حدود شہر سے باہر نہ جاتا تھا ایک سال قحط پڑ کر حالت ابتر ہوگئی تو ہاشم (آنحضرتؐ کے پردادا) نے تجارت کے لئے شام کا سفر کیا، کارواں کے سردار کے اچھے طرز عمل کی اطلاع قیصر روم تک پہنچی، وہ فیاض، مہمان نواز، اور دیگر اچھے اخلاق کا حامل ہے۔ اپنے استعجاب کی تشفی کے لئے قیصر نے ہاشم کو حضور میں طلب کیا اور گفتگو کے بعد اسے اجازت دی کہ تجارتی کارواں شام لایا کرے اور وہاں اپنے ملک کی پیداوار بیچے، مثلاً حجاز کے چمڑے اور یمن کے کپڑے، سفر واپسی میں ہاشم نے شام سے مکے تک راستے میں پڑنے والے قبیلوں سے (عبور و مرور کی سلامتی) کے معاہدے کئے ———— یعقوبی نے یہ بھی اضافہ کیا ہے کہ ہاشم نے ایک مماثل معاہدہ حبش کے نجاشی سے بھی کیا، پھر ہاشم کی وفات پر (اس کے بھائی) عبدشمس نے حبش کا سفر کیا کہ اس اجازت نامے کی تجدید کرائے۔

ایک اور مورخ ابن حبیب نے اپنی کتاب المنمق (ص ۳۱ تا ۴۴) باب "حدیث الایلاف" میں اس کی مزید تفصیلیں دی ہیں۔ اور الکلبی کے حوالے سے ہاشم اور قیصر کی گفتگو نقل کی ہے۔

چنانچہ لکھا ہے کہ ہاشم نے قیصر سے کہا کہ اگر حجازی پیداوار وہ خود لاکر بیچے تو (درمیانی واسطے نہ ہونے کی وجہ سے) وہ سستی پڑے گی (فھو أرخص علیکم) قیصر کی اجازت ملنے پر ہاشم مکہ واپس آیا ایک بڑا تجارتی کاروان تیار کیا اور شام لے گیا۔ ابن حبیب لکھتا ہے کہ اس دوسرے سفر کی اثنا میں ہاشم نے شہر غزہ میں (جو عرب کے انتہائی شمال میں علاقہ فلسطین میں بحر متوسط پر واقع ہے)

وفات پائی اور اسے وہیں دفن بھی کر دیا گیا! یہ کہ ایک مماثل مقصد کے لئے ہاشم کے بھائی المطّلب نے یمن کا سفر کیا اور ردمان (یمن) میں وفات پائی: تیسرا بھائی نوفل کارواں لیکر عراق گیا کیونکہ کسریٰ ایران نے اسے اس کی اجازت دی تھی۔ نوفل کی وفات سلمان (عراق) میں ہوئی! صرف چوتھا بھائی عبدشمس حبش کے کاروان سفروں کے باوجود اپنے گھر میں فوت ہوا اور مکے میں دفن کیا گیا، شاعر مطرود الخزاعی نے اس کا ذکر اپنے مرثیے میں یوں کہا ہے (ترجمہ از عربی):

ایک قبر سلمان میں، ایک قبر
ردمان میں اور ایک قبر غزات (غزہ) میں۔
اور ایک حبس کی وفات
حجون کے قریب ثنیات کے مشرق میں ہوئی۔

طبقات ابن سعد (طبع یوروپ جلد اول، حصہ اول ص ۴۳ تا ۴۶) میں کئی ماخذوں کی مدد سے تفصیل دی گئی ہے، چنانچہ الکلبی کے مطابق سب سے بڑے بھائی المطّلب نے نجاشیٔ حبش سے، ہاشم نے شام کے ہرقل سے —— (گویا ہرقل رومی شہنشاہوں کا لقب ہو) — نوفل ذکسریٰ عراق سے اجازت حاصل کی کہ ان کے علاقوں میں تجارتی کارواں لایا کریں۔ ابن عباس کی روایت کے مطابق سردیوں میں کارواں یمن جاتے اور گرمیوں میں غزہ بلکہ انقرہ تک چلے جاتے۔ آگے چلکر ابن سعد نے لکھا ہے کہ قیصر نے نہ صرف ہاشم کو رومی علاقے میں کارواں لانے کی اجازت دی، بلکہ ایک سفارشی خط نجاشی کے نام بھی دیا جس میں حبش کے بادشاہ سے سفارش کی تھی کہ وہ بھی مکی تاجروں کو مماثل اجازت دے، ابن سعد نے یہ بھی لکھا ہے کہ ہاشم نے راستے پر پڑنے والے قبیلوں سے بھی معاہدے کئے جن میں یہ قرارداد تھی کہ ان قبیلوں کا سامان قریش رومی منڈیوں تک خود مفت لیجائیں گے اور جو قیمت وصول ہو وہ کمیشن لئے بغیر ان کو ادا کردیں گے (معاوضہ میں قبیلہ کارواں کی سلامتی کا ذمہ دار ہوگا) ابن سعد نے مزید برآں یہ بھی صراحت کی ہے کہ قیصر سے اجازت ملنے کے بعد ہاشم جب مکرر (آخری مرتبہ) شام کے سفر پر روانہ ہوا تو اثنائے راہ میں مدینے سے گزرتے وقت وہاں ایک نوجوان بیوہ سے نکاح کیا پھر آگے روانہ ہوکر یکایک غزہ میں وفات پائی۔ چند ماہ بعد سوگوار بیوی کو عبدالمطلب نامی لڑکا پیدا ہوا (یعنی آنحضرتؐ کا دادا)

تاریخ طبری (طبع یوروپ سلسلہ اول صفحہ ۱۰۸۹) میں لکھا ہے کہ یہ معاہدہ شام کے رومی اور غسانی افسروں سے طے ہوا تھا، یہ کہ ہاشم کے بھائی عبدشمس نے حبش کا سفر کیا کہ نجاشی سے مماثل معاہدہ کرے، یہ کہ ایک اور بھائی نوفل کسریٰ ایران سے ملنے عراق گیا تاکہ عراق اور ایرانی سرزمین میں آنے کی مماثل اجازت حاصل کرے، اور یہ کہ ایک اور بھائی المطّلب نے یمن کا سفر کیا تاکہ وہاں کے حمیری بادشاہ سے بھی اسی طرح کا اجازت نامہ حاصل کرے۔

ابن حبیب کی کتاب المنمق (ص ۲۶۳ تا ۲۶۴) میں اسی موضوع پر ایک دوسرا باب بھی جس کا عنوان ہے "حدیث الحلیفین" اس میں الکلبی کی روایت نقل ہوئی ہے کہ ابتداً قریش کی یہ عادت تھی کہ ہر سال دو مرتبہ کاروانی سفر کریں: سردیوں میں یمن کا گرمیوں میں شام کا۔ رفتہ رفتہ یہ ان کے لئے دو بھر ہوگیا — (اس لئے کہ وہ مالدار اور آرام طلب ہو گئے تھے؟ یا اس لئے کہ اصل کاربرداز تاجر بوڑھے ہو گئے تھے؟) — اس پر تبالہ اور جُرَش نیز یمن کے بعض دیگر ساحلی رقیبوں کے باشندے سامان پہنچانے کا کام خود انجام دینے لگے۔ بری تاجر جنوبی مشرقی مضافات مکہ یعنی المحصب تک سامان پہنچاتے، اور بحری تاجر بندرگاہ جدہ تک۔ اس طرح اہل مکہ کو خود سفر کرنے کی حاجت نہ رہی، مگر ایک مرتبہ ایسا قحط پڑا جو مسلسل کئی سال تک جاری رہا اور اہل مکہ کے سارے سرمائے خرچ ہو گئے، اس وقت ہاشم نے شام کے سفر کا ارادہ کیا۔ وہاں اس نے بڑی مقدار میں روٹیاں خریدیں اور انہیں مکہ لاکر چورا چورا کیا (کہ سخت ہو گئی تھیں) اور انہیں ایک گرم شوربے میں ڈال کر اہل مکہ کو

ضیافت کی، اسی سبب سے اسے ہاشم کے لقب سے یاد کیا جانے لگا (جس کے معنے ہیں "چورچور کرنے والا") ورنہ اس کا نام اصل میں عمرو تھا۔

نظام الدین القمی نے اپنی تفسیر میں سورۂ ایلاف کی بحث میں ان معلومات کا اضافہ کیا ہے کہ مذکورہ بالا بحری تاجر حبشی تھے اور یہ کہ مکے والے جدے تک اپنے گدھے لیجاتے تاکہ کشتیوں سے اتارا ہوا مال مکے تک لائیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان حبشی تاجروں نے بعد میں اپنا حلقۂ عمل وسیع تر کرلیا اور اپنا درآمد کردہ مال خود ہی مکے تک پہنچانا شروع کیا۔ اس سلسلے میں ایک چھوٹے سے واقعے کا بلاذری (انساب الاشراف، مخطوطہ استانبول ۲/۵۲۴) اور ابن عبدربہ (العقد الفرید ۲/۷۴) نے ذکر کیا ہے وہ یہ کہ ایک مرتبہ قحط سالی کے زمانے میں حبشی تاجر سامان مکہ لائے مگر وہاں چند نوجوانوں نے اسے فوراً لوٹ لیا، اہل مکہ (قریش) ڈرے کہ کہیں اس کے برے نتائج میں حبشی سامان کی درآمد ہی بند نہ ہو جائے۔ چنانچہ انھوں نے نجاشی کے ہاں ایک سفارت بھیجی اور چند آدمی بطور یرغمال بھی اس کے سپرد کئے، تاکہ اسے اپنی حسن نیت کا یقین دلائیں۔ نجاشی ابویکسوم[1] نے ان یرغمالوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کیا۔

ابن ہشام (سیرۃ رسول اللہ، طبع یوروپ، صفحہ ۳۷ تا ۳۸، ۸۷ تا ۹۴، اور ۱۱۳ تا ۱۱۴) کے ہاں کوئی خاص نئی چیز نہیں وہ مذکورہ قصے کا خلاصہ بیان کرتا اور چند اشعار نقل کرنے پر اکتفا کرتا ہے، اس کتاب کے شارح سہیلی (الروض الانف ۱/۴۸، ۹۴ تا ۹۷، ۱۱۰) نے کوئی نئے معلومات نہیں دئے ہیں، البتہ یہ امر قابل ذکر ہے کہ اس مولف کے ہاں (ص ۴۸ پر) جن حکمرانوں نے کارواں لانے کی اجازت دی تھی ان میں مصر کے بادشاہ کا ذکر ہے، یمن کے حکمران کا نام نہیں ممکن ہے سہو قلم ہو۔

البلاذری (انساب الاشراف، طبع مصر ۱/۵۹) میں مختصر ذکر ہے اور لکھا ہے کہ ہاشم نے شام وغیرہ کے حکمرانوں سے "عصم" یعنی حفاظت کی اطمینان دہانیاں حاصل کیں۔

آخر میں مسعودی (مروج الذہب، طبع یوروپ ۳/۱۲۱ تا ۱۲۲) قابل ذکر ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ "قریش نے بادشاہوں سے ایلاف حاصل کیا اور یہ کہ اس لفظ کے معنے ہیں امن" پھر اس مؤلف نے تائید میں مطرود الخزاعی کی بیتیں نقل کی ہیں جن میں ان مذکورہ معاہدوں کو لفظ "عہد" سے موسوم کیا گیا ہے۔

ان واقعات کی توقیت اور حکمرانوں کا تعین

جیسا کہ نظر آئیگا سارے ہی مؤلف اس پر متفق ہیں کہ یہ معاشی و سفارتی کارنامہ ہاشم نے انجام دیا تھا۔ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پردادا ہیں، ہمارے ماخذوں میں واقعے کی تاریخ بیان نہیں ہوتی ہے لیکن اس کا تعین کرنا دشوار نہیں معلوم ہوتا۔

ابن ہشام (صفحہ ۱۰۸) کے مطابق رسول کریمؐ کے دادا عبدالمطلب کی وفات کے وقت آنحضرتؐ کی عمر آٹھ سال کی تھی۔ انساب بلاذری (۱/۸۴) وہ ساری روایتیں جمع کی گئی ہیں جن میں عبدالمطلب کی عمر کا ذکر ہے: وفات ۸۲ یا ۸۸ یا ۱۱۰ سال کی عمر میں ہوئی۔ بلاذری (حوالۂ بالا) ابن حبیب (کتاب المحبر ص ۱۷۴) نیز دیگر بعض مؤلفوں نے تو عبدالمطلب کی وفات ۱۴۰ سال کی

[1] اس زمانہ میں یکسومی خانوادے کی حبش میں حکومت تھی معلوم نہیں اسی کی طرف اشارہ ہے، یا واقعی اس نجاشی کے بیٹے کا نام بھی یکسوم تھا، یمن کے سد مارب پر ابرہہ کا جو کتبہ ہے اس میں ابرہہ کے ایک بیٹے کا نام یکسوم ہی لکھا ہے۔ اور اس ابرہہ کو بھی عرب مورخ ابویکسوم کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ آیا نجاشی یعنی حبش کے بادشاہ کا بھی یہی نام تھا، یہ معلوم نہیں۔

عمر ہی قرار دی ہے ان سب کا اوسط یعنی ۱۱۰ سال قرین قیاس معلوم ہوتا ہے اور عام طور پر مورخ یہی عمر بیان کرتے ہیں یہ بھی قابل ذکر ہے کہ مورخوں (انساب الاشراف للبلاذری ۸۸/۱ اور محبّر لابن حبیب، ص ۲۹۶) کے مطابق سن رسیدگی کے باعث عبدالمطلب کی بصارت بالکلیہ زائل ہوگئی تھی۔

چونکہ رسول اکرم کی ولادت ۵۶۹ء میں ہوئی اور جب آپ کی عمر آٹھ سال کی تھی تو عبدالمطلب نے وفات پائی ۵۷۸ء میں اور ولادت اس سے ۱۱۰ سال قبل ۴۶۷ء میں ہونی چاہیے۔ ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ عبدالمطلب کی ولادت مذکورہ بالا معاہدات کے تقریباً ڈیڑھ سال بعد ہوئی۔ اس طرح ایلاف کا زمانہ کم و بیش ۴۶۵ء کا سمجھا جا سکتا ہے۔

اس زمانہ میں کون کہاں کا بادشاہ تھا؟

رومی قسطنطنیہ کا بیزنطینی (رومی) حکمراں اس زمانے میں لیون اعظم (پہلا لیون) تھا جس نے ۴۵۷ء تا ۴۷۴ء حکومت کی۔ اس کے زمانہ میں افریقہ میں شدید جنگیں ہوئیں اس کے عہد میں ایران سے تعلقات پرامن تھے اس لئے ہر قسم کی معاشی سرگرمی کا موقع ملا ہوگا۔ سلطنت روما کے جب دو ٹکڑے ہوئے تو مصر بیزنطیوں کے قبضے میں رہا اور کہتے ہیں کہ انھوں نے تجارتی حمل و نقل کو خشکی کے کاروانوں کی جگہ سمندری جہازوں کے ذریعے سے انجام دینا شروع کیا افریقہ میں جنگ چھڑی تو لازماً سارے بحری وسائل فوج اور ہتھیار روانہ کرنے میں لگا دیئے گئے ہوں گے، ان حالات میں یمن، ہندوستان اور باقی مشرقی ممالک سے جن چیزوں کی درآمد ہوا کرتی تھی اس کے لئے یہ قابل فہم اور معقول چیز ہے کہ ان خشکی کے کاروانوں کو دوبارہ زندہ کیا جائے جو مکہ سے گزرا کرتے تھے۔

ایرانی ۴۶۵ء کی تاریخ پر ایران میں خسرو پرویز تخت پر نظر آتا ہے۔ نولڈیکے اور کرسٹنسن کے مطابق یہ ۴۵۹ء تا ۴۸۴ء حکمراں رہا مگر اس میں سہو معلوم ہوتی ہے۔ ابن حبیب (کتاب المحبّر، ص ۳۶۱ و ما بعد) کا بیان زیادہ قرین قیاس ہے کہ پرویز نے ۴۵۹ء سے ۴۸۴ء تک حکومت کی۔ مندرجۂ ذیل واقعے سے معلوم ہوسکے گا کہ اس بادشاہ کو بیرونی کاروانوں اور درآمدوں کی کیوں ضرورت پیش آئی

"اس کی حکومت کے زمانہ میں ایک قحط پڑا لیکن بادشاہ نے اس سے اچھی طرح نمٹ لیا۔ جو کچھ خزانہ شاہی میں تھا وہ اس نے بانٹ دیا اور محصول (ٹیکس) کی وصولی بند کردی۔ اور جتنا ہوسکتا تھا نظم و نسق کو بہتر بنادیا۔ صرف ایک شخص کو مستثنیٰ کردیں تو کوئی آدمی اس زمانے میں قحط کی وجہ سے نہ مرا...... دیگر راویوں کے مطابق یہ قحط مسلسل سات سال تک جاری رہا، نہروں اور چشموں کا پانی سوکھ گیا، درخت اور جنگل خشک ہوگئے۔ زراعت اور نباتات عام طور پر مرگئے، چاہے میدانوں میں ہوں کہ پہاڑوں پر۔ پرندے اور جنگلی جانور بھوک سے ہلاک ہوگئے، گھریلو جانور قحط زدگی سے اتنے کمزور ہوگئے کہ حمل و نقل کے لئے ان پر کوئی چیز لادی نہیں جاسکتی تھی۔ دریائے دجلہ میں پانی اتر گیا اور غذا کی کمی مایحتاج کی قلت اور ہر قسم کی مشکلوں کے باعث لوگ عام طور پر قحط کا شکار ہوگئے۔ اس پر بادشاہ (پرویز) نے رعایا کے نام فرمان صادر کیا اور انھیں اطلاع دی کہ انھیں محصول مالگزاری جزیہ (محصول جنگی) اور نائبہ (دیگر عارضی محصولوں) اور بیگاری سے معاف کیا جاتا ہے؛ یہ کہ اب وہ اپنے مالک آپ ہیں۔ اور یہ کہ وہ انھیں حکم دیتا ہے اپنی بقا و گزر کے لئے غلہ فراہم کرنے کی ساری ممکنہ کوشش کریں، بادشاہ نے ان کے نام ایک

اور فرمان بھی جاری کیا، اس میں انھیں حکم تھا کہ چھپائے ہوئے جمع کئے ہوئے اور غلے کے دیگر ذخیرے نکالیں جو کہ انسانوں کے لئے غذا کا کام دیتے ہوں، آپس میں مساوات ملحوظ رکھیں، ترجیحات کو نظر انداز کریں، امیر اور غریب میں یکسانی پائی جائے، چھوٹے بڑے میں تفریق نہ ہو۔ بادشاہ نے انھیں متنبہ کیا کہ اگر کہیں کوئی شخص فاقہ کشی سے مرے تو اس پورے شہر یا گاؤں کے باشندوں کو سزا دی جائے گی اور بہت سخت سزا دی جائے گی پرویز نے اس قحط کے زمانے میں نظم و نسق اس طرح چلایا کہ کوئی شخص بھوک کی وجہ سے ہلاک نہ ہونے پایا۔ صرف "اردشیر خرہ و فیروز" نامی مقام پر ایک واردات ہوئی۔ پھر اس زمانے میں بادشاہ نے خدا سے رجوع کیا اور برسات کے لئے اس سے دعا کی، خدا نے اس کی دعا قبول فرمائی اور ملک حسب سابق سرسبز ہو گیا پانی کو افراط ہو گیا اور درخت ہرے بھرے ہو گئے۔" (تاریخ طبری' طبع یوروپ سلسلۂ اول صفحہ ۱۰۴۷ تا ۱۰۴۸، کرسٹنسن کی فرانسیسی تاریخ ساسانیاں، ص ۴۸۵ تا ۴۸۶)

یمنی | جہاں تک یمن کے حکمران کا تعلق ہے اس سے مراد غالبا تبع بن حسان بن تبع ہے جس نے مشہور الحارث بن عمرو الکندی (مشہور شاعر امرؤ القیس بن حجر کے دادا) کو اپنا نائب اور سپہ سالار بنایا تھا۔ اس کے متعلق تاریخ طبری (ص ۸۸۱ تا ۸۸۲) میں لکھا ہے: "اسے جنات نے (ویران صحرا میں) بھٹکا دیا تھا، مگر وہاں سے وہ صحیح سلامت واپس آگیا وہ علم نجوم کا سب سے بڑا ماہر اور اپنے زمانے کے عالموں میں سب سے زیادہ عقلمند تھا، اور تاریخ گذشتہ اور آئندہ واقعات کو پیشین گوئی کی واقفیت بھی سب سے زیادہ اسی کو تھی پھر وہ تبع بن حسان بن تبع بن ملکیکرب بن تبع الاقرن کے نام سے حکمران بنا۔ حمیری (جنوبی عرب والے) ہوں کہ دیگر عرب، سب اس سے تھرّاتے تھے۔ اس نے اپنے بھانجے الحارث بن عمرو بن حجر الکندی کو ایک بڑی فوج کا سپہ سالار بنا کر قبائل مَعَد اور شہر حیرہ اور اس کے آس پاس علاقے کی طرف روانہ کیا، اس زمانے حیرہ کا بادشاہ النعمان بن امرؤ القیس (المعروف بہ ابن الشقیقہ) تھا، حارث وہاں پہنچا اور لڑائی کے بعد نعمان اور اس کے چند رشتہ داروں کو قتل کیا اور اس کی فوج کو شکست دی صرف بادشاہ کا بیٹا جو قبیلہ نمر کی ماء السماء نامی بیوی کے بطن سے پیدا ہوا تھا، اس قتل عام سے جان بچا کر بھاگ المنذر کا خانوادہ حکومت سے محروم ہو گیا اور الحارث بن عمرو اس کے علاقے کا بھی مالک ہو گیا۔" یہ حارث بہت دن تک حکمران رہا۔ اس نے اپنے بیٹوں کو فوج دے کر بھیجا کہ شام میں غسانیوں کی حکومت بھی چھین لے۔ یو کے مستشرق اولنڈر نے اپنی انگریزی کتاب:

LINDER, THE KINGS OF KINDA OF THE AMILY OF AKIL AL-MURAR

یعنی خانوادۂ اکل المرار کے حکمرانانِ کندہ، مطبوعہ لوند ۱۹۲۷ء ص ۷۸) میں اس کے متعلق لکھا ہے: "یہاں جس حمیری حکمران کی طرف اشارہ ہے اس سے مراد ہارتمان (ARTMANN, ARABISCHE FRAGE) کے مطابق شُرَحبیل یَکُف بن شرحبیل یعفر ہے جس کا ذکر کے ایک کتبے میں ملتا ہے۔ (اس بارے میں دیکھو گلازر GLASER ZWEI INSCHRIFTEN)

اس شرحبیل یَعفُر کا ذکر ریکمانس (G RYKMAN نے بھی مجلہ موزیون (MUSEON) جلد ۶۱، شمارہ ۳ ۱۹۴۸ء ص ۲۳۳ میں اپنے فرانسیسی مضمون (احمد فخری دریافت کردہ یمنی کتبے) میں کیا ہے، اس گمان کی تائید

اس واقعے سے بھی ہوتی ہے کہ حضرموت میں بمقام رابیہ ہر سال ایک میلہ لگتا تھا جس کے متعلق مورخ لکھتے ہیں۔

"وہاں جانا ہوتا تو قریشی تاجر تو خانوادہ آکل المرار سے خفارہ (بدرقہ) حاصل کرتے اور اس میلے کو جانے والے دوسرے لوگ حضرموت کے قبیلہ آل مسروق بن وائل سے خفارہ حاصل کرتے، یہ دونوں قبیلے خفارہ مفت مہیا کرتے لیکن قریش کی سرپرستی کے باعث قبیلہ آکل المرار سب پر غالب ہوگیا"

(ابن حبیب کی کتاب المحبر، ص ۲۶۷، اور المرزوقی کی الازمنہ والامکنہ، ۲/۱۶۵، ہر دو مطبوعہ حیدرآباد دکن)

حبشی حبش کے سلسلے میں ہمیں یہ تو معلوم ہے کہ اس زمانہ اس مشہور یکسومی خانوادہ وہاں حکمران تھا، لیکن ان بادشاہوں کے سلسلے میں زیر بحث زمانے کے متعلق کوئی تاریخی معلومات حاصل نہیں، اگر بعد کے زمانے کے واقعات کو معیار قرار دیا جائے تو اس میں عربی مورخوں کی بیان کردہ باتوں کو ناممکن قرار دینے کی کوئی وجہ نہیں پائی جاتی۔

مصری باقی رہتا ہے بادشاہ مصر، جس کا ذکر صرف سہیلی کے ہاں ہے، اگر یہاں کوئی غلطی یا سہو قلم نہیں ہے تو اس سے مراد کوئی بوزنطی گورنر ہوگا، بعد کے زمانے میں مکے والے تاجر اکثر مصر جایا کرتے نظر آتے ہیں لیکن مصر کے کسی بادشاہ کا، جیسا کہ سہیلی نے ذکر کیا ہے، کوئی پتہ نہیں چلتا۔

مکی تجارت کا نظام مکی تاجروں نے بین الممالک تعلقات کا جو وسیع اور حیرت انگیز سلسلہ قائم کیا اس کی جتنی بھی داد دی جائے کم ہوگی۔ جب تک پرانی صدیوں کی تجارتی روایتیں اور تجربے نہ رہے ہوں، ایسا نہیں ہو سکتا۔ انھوں نے تجارت کے سلسلے میں جو تعلقات پیدا کئے اور (ایلاف کے ذریعے سے) جو اجازت نامے حاصل کئے وہ کوئی بے معنی اور مردہ چیز ثابت نہ ہوئے بلکہ ایک زندہ حقیقت تھے، اس کا ثبوت قدیم قومی مورخ کے متخصص ابن الکلبی کے ہاں موجود ہے۔ اور "اسواق العرب" کا اس نے جو جیتا جاگتا تذکرہ کیا ہے (دیکھو ابن حبیب کی کتاب المحبر، ص ۲۶۳ تا ۲۶۸۔ المرزوقی کی الازمنہ والامکنہ ۲/۱۶۱ تا ۱۶۸۔ الیعقوبی کی تاریخ، طبع یورپ ۱/۳۱۳ تا ۳۱۵۔ قلقشندی کی نہایۃ الارب، طبع مصر ۴۶-۴۴) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مکے کے تاجر بیزنطینی علاقے میں بھی جاتے تھے، اور ایرانی بستیوں میں بھی جہاں وہ مقامی باشندوں اور تاجروں کے علاوہ ہندوستانی اور چینی تاجروں سے بھی ملتے تھے

یہ میلے ایک مستقل ادارہ تھے اور ہر سال معینہ وقت پر شروع ہوتے تھے، ایک مقام کے بعد دوسرے مقام کا میلہ کچھ اس جغرافی ترتیب سے مقرر تھا کہ سارے عرب کی چکر ہو جاتی تھی نیز جنوبی فلسطین اور جنوبی عراق کی بھی۔ ان میلوں کا آغاز (ماہ محرم میں) عرب کے شمال سے شروع ہوتا۔ پھر بعد کے مہینوں میں وہ مشرق میں لگتے، پھر جنوب میں، پھر مغرب میں سال کے اواخر (ذی حجہ) میں۔ مزید برآں خفارے (بدرقے) کا مؤثر نظام موجود تھا جس کے ذریعے سے کاروان والوں کی جان و مال کی بخوبی حفاظت ہوتی، عرب کے مختلف علاقوں (قبیلوں) میں حفاظت کا اطمینان حاصل کرنے کے لئے ظاہر ہے کہ پیشگی ان قبیلوں سے سفارتی کارکردگی کے ذریعے سے معاہدے کئے جائیں۔ اس پر مستزاد حرام مہینوں (اشہر حرم) کا ایک ادارہ بھی پایا جاتا تھا جس کے باعث ہر سال دو مرتبہ مکہ کا راستہ سارے عرب کے لوگوں کے لئے کھل جاتا اور پر امن ہو جاتا تھا، حج اکبر کے زمانے میں مسلسل تین مہینے تک یعنی ذیقعدہ، ذی الحجہ اور محرم میں، اور حج اصغر یا عمرے کے زمانے میں ایک ماہ کے لئے پورے رجب میں لڑائی بھڑائی حرام سمجھی جاتی اور قافلوں تک کو کوئی چھیڑ نہ سکتا، جہاں تک خود اہل مکہ کا تعلق ہے، ان کے لئے بسل کا مشہور ادارہ پایا جاتا تھا (جس کا ذکر سیرۃ ابن ہشام ص ۷۶ میں اور فیروز آبادی کی القاموس میں مادہ "ب س ل" کے تحت ملے گا) اور چند مکی قبیلوں کو پورے آٹھ مہینے ... اور تجارت

خیال میں اشہر حرم کے چار مہینوں کے علاوہ کہ اس سے سارے ہی لوگ متمتع ہوتے، گویا سال تمام — سارے عرب میں امن حاصل رہتا۔ اور وہ جہاں اور جس قبیلے کے علاقے میں چاہتے جا سکتے، یہ امتیاز اصل میں تو مکے کے چند خانوادوں کو حاصل ہوا تھا۔ لیکن اس سے دوسرے لوگ بھی بہ آسانی استفادہ کر سکتے۔ یعنی وہ ان خاندانوں کے کسی فرد کا خفارہ حاصل کر لیں تو وہ ان کے ساتھ ہر جگہ جاتا اور حفاظت مہیا کر سکتا۔ اس خدمت کا اس شخص کو حسب معمول کوئی معاوضہ دیدیا جاتا۔

خلاصہ اس بحث سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے جزیرہ نمائے عرب اسلام سے پہلے تجارتی اغراض کے لئے ایک وفاق میں منسلک ہو کر متحد ہو چکا تھا، اس سے اس سیاسی اتحاد کا راستہ بن گیا جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا کارنامہ ہے۔

مذکورۂ بالا تاریخی واقعات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ قریش مکہ نے جو وسیع اور بارآور سفارتی سرگرمی دکھائی وہ عرب ہی نہیں عربوں کے نسلی وجغرافیائی وسیاسی حدود کے باہر تک بھی مؤثر ہو چکی تھی۔

ان سارے بیانات کو کوئی شخص چاہے تو محض خیالی کہہ کر رد کر سکتا ہے، ہمارا مقصد یہاں یہ ہے کہ اس مواد کو جو منتشر پایا جاتا تھا یکجا اور اکٹھا کر دیں، محض گمان کے ذریعے سے واقعات تراشنے "خواہش" کو "حقیقت" سمجھنے اور "ہوا ہونا چاہیے" کہنے کے مقابلہ میں دستاویزوں اور تاریخی بیانوں کو بہرحال زیادہ وقعت دینی پڑے گی، ہماری رائے میں یہ ناممکن نہیں کہ ان عربی بیانات میں کہیں کہیں کچھ مبالغہ کیا گیا ہو، لیکن ان کو محض بے بنیاد نہیں کہا جا سکتا۔

ضمیمہ اوپر کتاب المنمق مؤلفہ ابن حبیب کا ذکر آیا ہے حال میں دائرۃ المعارف نے چھاپ بھی دیا ہے، جن لوگوں کی اس تک دسترس نہ ہو ان کے فائدے کے لئے اس کے دو بابوں کو یہاں مع ترجمہ نقل کیا جاتا ہے:

(۱) حدیث الایلاف

عن ابن الکلبی قال: کان من حدیث الایلاف ان قریشا کانت تجارا، وکانت تجارتھم لا تعدو مکۃ، انما یتقدم علیھم الاعاجم بالسلع فیشترون منھم ثم یتبایعون بینھم ویبیعون من حولھم من العرب فکانت تجارتھم کذلک حتی رکب ھاشم بن عبد مناف الی الشام فنزل بقیصر واسمہ ھاشم یومئذ عمرو، فکان یذبح کل یوم شاۃ فیصنع جفنۃ ثرید فیدعو من حولہ فیاکلون وکان ھاشم فیما زعموا احسن الناس عصبا واجملھم فذکر لقیصر وقیل: ھھنا رجل من قریش یھشم الخبز ثم یصب علیہ المرق و یفرغ علیہ اللحم، وانما کانت الاعاجم تصنع المرق فی الصحاف ثم یوتدم بالخبز، فلذلک سمی ھاشم۔ وبلغ

(۱) ایلاف کا قصہ

ابن الکلبی کی روایت ہے کہ ایلاف کا قصہ یوں ہوا کہ مکے کے باشندے یعنی قریش تاجر لوگ تھے لیکن ان کی تجارتی سرگرمیاں مکے سے آگے نہ بڑھتی تھیں بلکہ اجنبی لوگ سامان لیکر آتے تو یہ ان سے خریدتے، پھر مکے والوں کو بھی بیچتے اور آس پاس رہنے والے عربوں کو بھی ان کی تجارت کا یہی حال رہا تا آنکہ ہاشم شام کے سفر پر روانہ ہوا اور قیصر[1] کے سکونتی علاقے میں ٹھیرا، اس وقت تک ہاشم کا نام عَمرو تھا۔ وہ ہر روز ایک بکری کاٹتا اور گوشت اور روٹی سے پکائے جانے والے ثرید کے پیالے دسترخوان پر رکھے جاتے اور دعوت عام ہوتی کہ آس پاس کا ہر شخص آکر کھائے کہتے ہیں کہ ہاشم گٹھے ہوئے بدن کا اور بہت خوبصورت شخص تھا، اس کی اطلاع قیصر تک پہنچائی گئی کہ یہاں ایک قریشی آیا ہے جو روٹی کو چورا چورا کر کے اس پر شوربا ڈالتا پھر اس میں گوشت ملاتا ہے۔ بات یہ ہوئی کہ عجمی لوگوں کی عادت یہ تھی وہ شوربا تھالیوں میں رکھتے اور تھوڑی سی روٹی بطور سالن کے چکھتے۔ اور اسی لئے اسے "ہاشم" کا لقب دیا گیا جس کے معنی ہیں

[1] قیصر عموماً ولی عہد اور شام کے نائب السلطنت کا لقب ہوا کرتا تھا ممکن ہے یہاں وہی مراد ہو، نہ کہ بیزنطینی شہنشاہ۔

ذلك قیصر فدعا به فلما رأه وكلمه أعجب به. فكان يرسل اليه فيدخل عليه، فلما رأى مكانه منه قال له هاشم: "ايها الملك ان لي قوما وهم تجار العرب فإن رأيت ان تكتب لهم كتابا تؤمنهم وتؤمن تجارتهم فيقدموا عليك بما يستطرف من ادم الحجاز وثيابه فيكونوا يبيعونه عندكم فهو أرخص عليكم" فكتب له كتابا بأمان من أتى منهم فاقبل هاشم بذلك الكتاب فجعل كلما مر بحي من العرب بطريق الشام اخذ من اشرافهم ايلافا فالايلاف ان يامنوا عندهم في ارضهم بغير حلف عليهم، وانما هو امان الناس وعلى ان قريشا تحمل لهم بضائع فيكفونهم حملانها ويردون اليهم راس مالهم وربحهم فاخذ هاشم الايلاف ممن بينه وبين الشام حتى قدم مكة فاتاهم باعظم

چورا چورا کرنے والا۔ قیصر کو اطلاع ملی تو اسے بلایا۔ جب ملاقات اور گفتگو کی تو بہت اچھا اثر لیا چنانچہ وہ اسے اکثر بلایا کرتا اور ملاقات کرتا۔ جب ہاشم نے اپنا رسوخ دیکھا تو ایک دن اس سے کہا، "اے بادشاہ، میری بھی ایک قوم ہے جو سارے عرب کی تجارت کی مالک ہے، اگر مناسب معلوم ہو تو انہیں نوشتہ دے کر جان کی حفاظت کا بھی یقین دلا اور تجارتی مال کی حفاظت کا بھی، تاکہ وہ حجاز کے اچھے چمڑے اور کپڑے لاکر تمہارے ہاں بیچا کریں اور یہ تمہیں زیادہ سستا پڑے گا" چنانچہ قیصر نے اسے ایک نوشتہ دیا کہ جو بھی عرب آئے حفاظت میں رہیگا ہاشم یہ نوشتہ لے کر واپس روانہ ہوا شام کے راستہ میں جس جس عرب قبیلہ سے گزرتا اس کے سرداروں سے ایلاف حاصل کرتا، ایلاف کے معنے ہیں ان کی سرزمین میں کسی حلیفی کے بغیر (رہ گزر کو) امن حاصل ہو، اور یہ امن سب لوگوں کو حاصل ہو، اس کے معاوضے میں قریش ان قبائل کا سامان تجارت خود لیجایا کریں گے حمل ونقل کے مصارف نہ مانگیں گے اور بیچنے کے بعد قیمت اور نفع دونوں ان کو واپس کردیں گے، اس طرح ہاشم نے اپنے اور شام کے درمیان جتنے قبیلے تھے سب سے ایلاف حاصل کیا

شئ اتوا به. فخرجوا بتجارة عظيمة وخرج هاشم يجوزهم ويوفيهم ايلافهم الذي اخذ لهم من العرب، فلم يبرح يوفيهم ذلك ويجمع بينهم وبين اشراف العرب حتى ورد بهم الشام واحلهم قراها فمات في ذلك السفر بغزة من الشام

اور جب وہ مکہ پہنچا تو (خوشخبری) لایا اس سے بڑی کوئی چیز ممکن نہ تھی پھر سب لوگ ایک بڑا تجارتی کارواں لے کر نکلے۔ ہاشم عربوں کے جس جس قبیلے سے گزرتا ان سے ایلاف کی شرط کی وعدہ وفائی کرتا رہا اور یہ وعدہ وفائی سب کے ساتھ ہوئی اور اپنے ہمراہیوں کے ساتھ قبائلی سرداروں کو بھی جمع کرتا رہا اور سب کو ساتھ لیکر شام پہنچا اور وہاں کے شہروں میں ٹھیرا لیکن وہ اسی سفر میں شام (فلسطین) میں بمقام غزہ فوت ہوگیا۔

(رحذفنا المراثی)

(دراصل میں یہاں کئی مرثیے ہیں جو حذف کئے جاتے ہیں)

فلما مات هاشم، خرج المطلب بن عبد مناف الى اليمن فاخذ من ملوكهم عهدا لمن تجر قبلهم من قريش، ثم اقبل ياخذ الايلاف ممن مر به من العرب حتى اتى مكة على مثل ما كان هاشم اخذ وكان المطلب اكبر ولد عبد مناف وكان يسمى الفيض. فهلك المطلب بردمان من اليمن وهو راجع الى اليمن

جب ہاشم کی وفات ہوگئی تو (اسکا بھائی) مطلب بن عبد مناف یمن گ[یا] اور وہاں کے حکمرانوں سے عہد لیا کہ جو قریش ان کے ہاں تجارت کیلئے آئے (اسے امن رہیگا)، پھر راستے میں جتنے عرب قبیلے پڑتے تھے ا[ن سے] بھی ایلاف حاصل کرتا گیا اور ویسے معاہدوں کے ساتھ مکہ آیا جیسے [ہاشم] نے کیا تھا، عبد مناف کے بچوں میں مطلب سب سے بڑا بیٹا تھا۔ اسے فیض کے [نام] سے یاد کیا جاتا ہے وہ جس و[قت] (مکرر) یمن کو جارہا تھا تو یمن میں ردمان فوت ہوگیا۔

وخرج عبد شمس بن عبد مناف الى ملك الحبشة فاخذ منه

عبد شمس بن عبد مناف حبشہ [کے] بادشاہ کے پاس روانہ ہوا او[ر]

كتابا وعهدا ليمن تجر قبله من قريش، ثم اخذ الايلاف ممن بينه وبين العرب حتى بلغ مكة، وهلك عبد شمس بمكة فقبر بالحجون، وكان اكبر من هاشم

ہاں تجارت کے لئے آنے والے قریشیوں کے حق میں ایک نوشتہ اور عہد حاصل کیا، پھر ان (قبائل) سے بھی ایلاف لیا جو راستے میں پڑتے ہیں اور وہ اسی طرح کامیاب مکہ واپس آیا عبد شمس کی وفات مکے میں ہوئی اور اسے حجون میں دفن کیا گیا۔ عمر میں یہ ہاشم سے بھی بڑا تھا۔

وخرج نوفل بن عبد مناف وكان اصغر ولد عبد مناف.... فخرج الى العراق فاخذ عهدا من كسرى لتجار قريش ثم اقبل يأخذ الايلاف ممن يمر به من العرب حتى قدم مكة ثم رجع الى العراق فمات بسلمان من ارض العراق.

اور نوفل بھی سفر پر نکلا، یہ عبد مناف کے بیٹوں میں سب سے چھوٹا تھا.... وہ عراق روانہ ہوا اور کسریٰ سے قریشی تاجروں کے حق میں عہد حاصل کیا۔ پھر ان سب عرب (قبائل) سے بھی ایلاف حاصل کرتا گیا جن کے علاقوں سے گزرنا پڑا۔ اور اس طرح مکہ واپس آیا پھر جب وہ (دوبارہ) عراق روانہ ہوا تو عراقی سرزمین میں بمقام سلمان فوت ہوگیا۔

وكان بنو عبد مناف هؤلاء اول من رفع الله به قريشا، لم تر العرب مثلهم قط اسمح ولا اعلم ولا اعقل ولا اجمل، انما كانوا نجوما من النجوم... كتاب المنمق (ص ۳۱ تا ۳۴)

عبد مناف کے یہ بیٹے وہ لوگ ہیں جن کے ہاتھوں ہی سب سے پہلے خدا نے قریش کی قدر و منزلت بلند کی، ان لوگوں سے زیادہ فیاض، عالم، عقلمند اور خوبصورت عربوں نے کبھی نہ دیکھے تھے، حقیقت میں یہ آسمان کے تارے ہی تارے تھے۔

(۲) حديث الرحلتين

(۲) دو کاروانی سفروں کا قصہ

الكلبي قال: كانت قريش تعودت رحلتين احداهما في الشتاء الى اليمن، والاخرى في الصيف الى الشام. فمكثوا بذلك حتى اشتد عليهم الجهد واخصب تبالة وجرش واهل الساحل من البحر من اليمن، فحمل اهل الساحل في البحر وحمل اهل البر على الابل، فنزل اهل الساحل بجدة، واهل البر بالمحصب فامتار اهل مكة ما شاؤا، وكفاهم الله الرحلتين كانوا يرحلون الى اليمن والشام فانزل الله عز وجل: "لايلاف قريش، ايلافهم رحلة الشتاء والصيف" وقوله: "وآمنهم من خوف" يريد خوف العدو، وخوف الجذام فليس في الارض قرشي جذم. والايلاف قريش يعني دأب قريش رحلة الشتاء والصيف فاصابت قريش سنوات ذهبن بالاموال فخرج هاشم الى الشام فامر بخبز كثير

کلبی کا بیان ہے کہ قریش کو سالانہ دو کاروانی سفروں کی عادت تھی ایک سردیوں میں یمن کی طرف دوسرے گرمیوں میں شام کی طرف وہ اسی عادت پر قائم رہے تا آں کہ یہ محنت ان پر بار گزرنے لگی پھر تبالہ اور جُرش نیز یمن کے ساحلی علاقے کے باشندوں کی بن آئی، چنانچہ ساحلی علاقے کے لوگ سامان تجارت سمندری راستے سے، اور اندرونی علاقے والے اونٹوں پر سامان لاد کر آنے لگے۔ ساحل والے جدہ میں لنگر ڈالتے اور خشکی والے (مکے کے مضافات میں) مُحَصَّب تک سامان پہنچاتے۔ اور یوں مکے والے جو چاہتے مایحتاج سامان حاصل کر سکتے، اور وہ یمن اور شام کے جو دو سفر کیا کرتے تھے ان سے خدا نے انھیں نجات دلائی۔ قرآن میں خدا نے یہی یاد دلاتے کے لئے وحی فرمائی ہے کہ "قریش کے ایلاف کے باعث، ان کے ایلاف ہی کے باعث سرما اور گرما کا کاروان چلتا ہے۔" نیز یہ آیت "اور اس نے خوف پر انھیں امن مہیا کیا۔" مراد یہ ہے کہ دشمن اور جذام کے خوف سے چنانچہ ساری سرزمین میں کوئی جذام زدہ قریشی نہیں ملے گا۔ اور ایلاف کے معنے ہیں قریش کی سردی اور گرمی کے کاروانی سفر کی عادت۔ پھر قریش کے لئے مسلسل کئی سال قحط پڑا جس سے ان کا سارا اندوختہ ختم ہوگیا۔ اس پر ہاشم شام روانہ ہوا اور وہاں بڑی مقدار میں روٹیوں کی فرمائش دی

فخبزله، فحمله فی الغرائر علی الابل حتی وافی مکۃ فهشم ذالک الخبز ونحر تلک الابل ثم طبخها والقی تلک القدور علی ذلک الخبز فاطعم اهل مکۃ و اشبعهم وکان ذلک اول الحیاء (کتاب المنمق ص ۲۶۲ تا ۲۶۳)

اور جب روٹیاں تیار ہو گئیں تو ان کو انھیں تھیلیوں میں بار کر کے اونٹوں پر لادا اور لیکر مکہ آیا یہاں اس نے ان روٹیوں کو چورا چورا کیا اور ان لانے والے اونٹوں کو ذبح کر کے پکوان کیا (گوشت اور شوربے) یہ دیگیں اس روٹی پر انڈیل گئیں اور یہ اس نے مکے والوں کو کھلایا اور پیٹ بھر کر کھلایا۔ اور یہ وہاں (نئی زندگی) کا آغاز تھا۔

(ابتدائی فرانسیسی اشاعت ۱۹۵۵ء ضروری تصحیحات کے ساتھ مؤلف ہی نے ترجمہ کیا)

دو نعتیں

(مولانا عبد العزیز شوقی)

دل ہو تو فدائے رُخ لیلائے مدینہ
جاں ہو تو رہینِ غم آقائے مدینہ

موقوف مری عمر دو روزہ ہے اسی پر
ہے روح رواں میری تمنائے مدینہ

عاشق کی نگاہوں سے کوئی دیکھے تو جانے
جنت سے کہیں بڑھ کے ہے صحرائے مدینہ

میں ہجر میں کب تک یونہی بے چین رہوں گا
سرکار دو عالم مرے آقائے مدینہ

ہر لحظہ مدینہ ہی مرے پیش نظر ہے
یا رب مری آنکھوں میں سما جائے مدینہ

للہ! ضیا پاش نظر مجھ پہ بھی کوئی
اے نورِ خدا انجمن آرائے مدینہ

ہاں سختیٔ محشر کا مجھے خوف نہیں ہے
کافی ہیں مرے واسطے مولائے مدینہ

شوقیؔ تہ دل سے یہ عقیدہ ہے ہمارا
فردوس کا حقدار ہے شیدائے مدینہ

مسجود ملائک وہی سر ہوتا ہے شوقیؔ
جس سر میں سما جاتا ہے سودائے مدینہ

اللہ بنا دے مجھے دیوانہ نبیؐ کا
ہو جائے مرا نام ہی مستانہ نبیؐ کا

ہر لحظہ زباں پر ہے مری نامِ محمدؐ
میں ذکر کیا کرتا ہوں روزانہ نبیؐ کا

شاہانِ زمانہ کو رہی جس کی تمنا
اعجاز تھا وہ رُعب فقیرانہ نبیؐ کا

طیبہ کہ جہاں چلتے ہیں توحید کے ساغر
میخانہ نبیؐ کا ہے وہ میخانہ نبیؐ کا

کیوں شمع رسالت پہ کروں دل جاں قربان
مسلم ہوں مجھے کہتے ہیں پروانہ نبیؐ کا

اے قصۂ اسکندر و دارا کے فدائی
سننا ہے تو سُن شوق سے افسانہ نبیؐ کا

شوقیؔ نہ رہے خُلد کی حسرت مرے دل میں
اللہ دکھا دے مجھے کاشانہ نبیؐ کا

حافظ نذیر احمد صاحب
پرنسپل شبلی کالج - لاہور

دینی مدارس کی ضرورت

یہ مقالہ مجلس مذاکرہ (چودہ صد سالہ جشن نزول قرآن کریم) منعقدہ جامع نوری شریف جھنگ میں زیر صدارت جناب وزیر تعلیم حکومت مغربی پاکستان ۱۴ر اپریل ۱۹۶۸ء کو پڑھا گیا

عام طور پر جدید تعلیمیافتہ اصحاب کا ایک گروہ اپنی محفلوں اور نجی مجلسوں میں گفتگو کا آغاز اس خیال سے کرتا ہے کہ اسلامی معاشرہ میں جداگانہ دینی مدارس کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس لئے کہ مسیحی پاپائیت اور ہندو برہمنیت کی طرح اسلام میں ملائیت کے لئے کوئی مقام نہیں ـــ ان حضرات کا یہ کہنا (دعوے کی حد تک) مبنی بر حقیقت ہے۔ اور کسی کو ان سے اختلاف نہیں ہونا چاہیے۔

لاریب اسلام میں نہ دین دنیا کی جداگانہ حدود ہیں، نہ دیندار اور دنیادار دو جداگانہ طبقات کی گنجائش ہے جو شخص توحید الٰہی اور رسالت محمدیہ (علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) پر ایمان رکھتا ہے اور احکام اسلام کے مطابق زندگی بسر کرتا ہے وہ دنیا داری کے تمام علائق سے وابستہ رہنے کے باوجود کامل دیندار رہتا ہے۔ اسے دیندار بننے کے لئے ترک دنیا کی قطعاً ضرورت نہیں۔

اسلام محض چند مذہبی رسوم کا نام نہیں۔ فقط جنکی ادائیگی سے آدمی دیندار بن جاتا ہو۔ بلکہ اسلام تو ایک کامل اور مکمل دین ہے وہ مذہب حیات ہے جو زندگی کے تمام مسائل میں رہنمائی کا دستور العمل پیش کرتا ہے۔ لیکن خرابی کی بات یہ ہے کہ ملائیت کی پھبتی کسنے والے حضرات نے علائق دنیوی میں گرفتار ہو کر دین سے اپنا واسطہ نہ ہونے کے برابر کر لیا ہے۔ نہ علم دین ہے نہ دینی فرائض کی بجا آوری کا اہتمام۔ وہ اپنی مسجد میں حاضر ہو کر نہ اذان پڑھنے کو تیار ہیں نہ نماز پڑھانے کو۔ اپنی قربانی کا جانور اپنے ہاتھ سے ذبح کرنا ان کے لئے مشکل ہے، اپنی بچی کا نکاح وہ نہیں پڑھا سکتے۔ اپنے کسی قریبی عزیز اور بزرگ کا جنازہ وہ نہیں پڑھا سکتے فریضہ تبلیغ کی بجا آوری اور دینی قیادت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، حالانکہ یہ امور ایک مسلمان کی روز مرہ زندگی کے معمولات کا حصہ ہیں۔ اب سوال ہے کہ یہ کام کون انجام دے اور دینی مدارس بند کر کے ان فرائض کی بجا آوری کا اہتمام کہاں ہوگا؟

حقیقت تو یہ ہے کہ ہمارے جدید تعلیمیافتہ طبقہ نے خود کو خالص دنیا دار بنا کر ایک جداگانہ دیندار طبقہ کی ضرورت پیدا کی ہے۔ اس پر ستم ظریفی یہ ہے کہ وہ علماء پر یہ تقاضہ کرتے ہیں کہ وہ ہمہ تن دین کے لئے وقف ہو کر رہ جائیں اور اپنے آپ کو خالصۃً دینی امور سے وابستہ نہ رکھیں۔

——— حالانکہ ملت اسلامیہ کی روحانی و اخلاقی قیادت کے لئے دینی تعلیم کی نشر و اشاعت کے لئے، اور اقصائے عالم میں اسلام کا پیغام حیات آفریں عام کرنے کے لئے اپنی زندگیاں وقف کرنے والوں کی ضرورت آج پہلے سے کہیں زیادہ ہے

یہی حال علم کی دنیا کا ہے، اس میں کوئی کلام نہیں کہ کوئی شعبۂ علم اپنی ذات میں نہ دینی ہے نہ دنیاوی۔ ہر وہ علم اور ہر وہ سائنس جو حقیقت پر مبنی ہے اور اسلامی تعلیمات سے ہم آہنگ ہے وہ دینی ہے خواہ ریاضی، فلسفہ، منطق اور نفسیات ہی کیوں نہ ہوں لیکن جس علم کی بنیاد حقیقت پر نہیں اور جس کے مفروضات اسلام کی بنیادوں سے ٹکراتے ہوں وہ یقیناً لادینی کہلائے گا۔ مسلمانوں نے ہمیشہ علوم کو اسی نظر سے دیکھا ہے، دینی مدارس کے نصاب پر نظر ڈالنے سے ہمارا یہ مفروضہ اور بھی مبدّل بہ یقین ہو جاتا ہے۔

دینی مدارس کے مروجہ درس نظامی میں مندرجہ ذیل علوم پڑھائے جاتے ہیں :۔

عربی زبان اور اس کے پانچ علوم۔

قرآن، حدیث، اسلامی فقہ، تاریخ اسلام، علم الکلام فلسفہ، منطق، مناظرہ، ہیئت و ہندسہ، اور طب۔

انصاف کیجئے کیا دینی مدارس میں زیر تدریس یہ علوم محض عبادات اور دینی مسائل کی حد تک محدود ہیں، کیا یہ دینی اور دنیوی دونوں علوم پر مشتمل نہیں، کیا اس قدر جامعیت اور ہمہ گیری مروجہ سرکاری نصاب تعلیم میں موجود ہے، ہمیں اس صورت حالات کو بھی فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ موجودہ درس نظامی اپنی موجودہ شکل میں مغلیہ دور سلطنت سے رائج ہے۔ اس زمانہ میں یہی نصاب مسلمانوں کا عمومی نظام تعلیم تھا۔ اس کے علاوہ دینداروں یا دنیاداروں کے لئے کوئی اور نصاب نہ تھا۔ اس کے فارغ التحصیل مسجد و منبر کے امام و مقتدیٰ ہوتے تھے اور اسی کے منتہی سرکاری مناصب کے اہل متصور ہوتے تھے۔

برصغیر پاک و ہند میں انگریزی اقتدار نے اپنے استعماری مقاصد کو پورا کرنے کے لئے نظام تعلیم میں دوئی پیدا کر دی اور اس جامع نصاب کے علی الرغم دوسرا سرکاری سیکولر نصاب رائج کر دیا ——— اب ہم نے اول الذکر عمومی نصاب (درس نظامی) کو دینی اور اپنے جدید نظام تعلیم کو دنیوی قرار دے لیا ——— پہلا نصاب مرور زمانہ کے باعث جدید تقاضوں کا حامل نہ رہا۔ اور جدید نصاب دینی مقاصد کا ہم آہنگ نہ بن سکا۔

اس حقیقت کی وضاحت کے لئے مروجہ سرکاری نظام تعلیم کا سرسری جائزہ کافی ہوگا۔ میٹرک کی سطح پر سو نمبر کی اسلامیات کے علاوہ سات مضمون اور لازمی ہیں مثلاً انگریزی، اردو، حساب، سائنس، معاشرتی علوم، شہریت، تاریخ، جغرافیہ وغیرہ۔ ان میں سے کسی مضمون کو تا حال اسلامی تعلیمات کے ہم آہنگ بنانے کی کوشش نہیں کی گئی۔

یہی حال ایف۔ اے۔ بی اے کے مضامین کا ہے۔

عربی محض اختیاری اور اضافی مضمون کے طور پر نصاب میں شامل ہے۔ اکثر سکولوں میں اس کی تدریس کے انتظامات ہی ختم کر دیئے گئے ہیں۔ یہاں تک کہ مرکزِ علم لاہور کے ایک گورنمنٹ گرلز ہائی اسکول، میں گذشتہ سال طالبات کی درخواست کے باوجود عربی کی معلّمہ کا تقرر عمل میں نہ آیا ——— عربی قرآن حکیم کی زبان ہے۔ احادیث نبوی کی ترجمان ہے۔ تاریخ و فقہ اسلامی کی امین ہے۔ عربی کے ساتھ ہماری دلچسپی کا

نتیجہ کیا ہوا ہے۔ اس کا جواب اعداد و شمار کی زبان سے سنئے :-

۱۹۵۳ء میں ۳۶،۵۵۸ طلبا و طالبات نے میٹرک کا امتحان دیا، ان میں عربی پڑھنے والے ۵۳۴۰ تھے

پانچ سال بعد ۱۹۵۸ء " ۵۸،۲۷۰ " " " " " " ۴۲۱۶ رہ گئے

دس سال بعد ۱۹۶۳ء " ۸۲،۱۰۷ " " " " " " ۳۲۴۸ رہ گئے

پندرہ سال بعد ۱۹۶۸ء " ۹۹،۹۶۷ " " " " " " ۴۹۹۲ تھے

گویا ۱۹۵۳ء میں میٹرک میں عربی پڑھنے والوں کا تناسب ساڑھے چودہ فیصد تھا —— لیکن پندرہ سال بعد جبکہ طلبہ کی مجموعی تعداد میں ۱۷۳ فیصد اضافہ ہو گیا عربی خواں طلبا و طالبات کا تناسب پانچ فیصد سے بھی کم ہو گیا یعنی طلبا کی تعداد ساڑھے چھتیس ہزار سے ایک لاکھ ہو گئی۔ مگر عربی خواں ۵۳۴۰ سے گھٹ کر ۴۹۹۲ رہ گئے۔

۱۹۵۳ء میں ایف اے میں پرانے نصاب کے اندر ۱۲۸۴۸ طلبا شریک امتحان ہوئے، ان میں ۱۱۱۵ عربی خواں تھے پندرہ سال بعد طلبا کی تعداد ۵۵،۸۴۰ ہو گئی اور عربی خواں طلبا کی تعداد ۱۱۱۹ —— گویا پندرہ سال میں طلبا کی تعداد میں ۳۳۳ فیصد اضافہ ہوا لیکن عربی خواں طلبا و طالبات ۸½ فیصد سے گھٹ کر صرف ۲ فیصد رہ گئے —— س سے بی اے۔ ایم اے کی کلاسز میں عربی کی تدریس کا اندازہ لر لیجئے :-

---

یہ تو قرآن حکیم کی زبان عربی کی کیفیت تھی۔ اب خود سلامیات کے مضمون کا جائزہ لیجئے۔ میٹرک تک تمام مسلم لباء کے لئے مضمون اسلامیات لازمی قرار دیدیا گیا ہے۔ وسال قبل یہ فیصلہ ہوا تھا لیکن ابھی تک اس کے لئے جداگانہ تاب مرتب نہیں کرائی گئی۔

دوسری طرف ایف اے میں اسلامیات محض اختیاری مضمون ہے وہ بھی صرف آرٹس کے طلبا کے لئے موجودہ قوانین کی رو سے مغربی پاکستان میں ایف ایس سی کا کوئی طالبعلم عربی کسی صورت میں نہیں پڑھ سکتا ہے۔

بی اے کے اندر کراچی یونیورسٹی اور حیدرآباد یونیورسٹی میں اسلامی نظام حیات کا ایک پرچہ لازمی ہے۔ لیکن پشاور اور پنجاب یونیورسٹیوں میں نہیں۔

فنی (Technical) اور پیشہ ورانہ (Professional) اداروں میں سرے سے نہ اسلامیات کا کوئی نصاب ہے نہ اس کی تدریس یعنی مغربی پاکستان کے کسی میڈیکل کالج، لا کالج، کامرس کالج، انجینئرنگ کالج میں اسلامیات کے نام سے کچھ شامل نصاب نہیں —— جبکہ ان فنی اور پیشہ ورانہ اداروں کی تعداد مغربی پاکستان میں ۵۰ ہے اور ان اداروں میں زیر تعلیم و زیر تربیت طلباء کی تعداد ہزاروں سے متجاوز ہے۔ —— گویا ہماری سرکاری پالیسی یہ ہے کہ ہمارے وکلاء، ڈاکٹر اور انجینئرز کو دینی تعلیم اور دینی امور سے آگاہی ضروری نہیں۔

ان حالات میں یہ کہنا کیسے درست ہے کہ پاکستان میں جداگانہ دینی درسگاہوں کی ضرورت نہیں اور ان مولویوں کا وجود بیکار محض ہے۔ یا اسلام میں علماء کے مخصوص گروہ کی حاجت نہیں —— میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ ان حالات میں دینی مدارس کا ذرا سا ضعف بھی عوام کو دین سے بیگانہ تر کرنے کا موجب ہوگا۔ اور دین کے لئے تھوڑا بہت جو کچھ کام ہو رہا ہے وہ بھی ختم ہو کر رہ جائے گا۔

ہر فن اور ہر علم کے لئے مخصوص تربیت اور مخصوص مزاج

کا ضرورت ہوتی ہے دین شناسی اور دینی علوم کو بھی اس کلیہ سے خارج نہیں کیا جا سکتا ہے۔ انگریزی، اردو، ریاضی تاریخ، جغرافیہ غرض کسی علم میں بھی درجۂ فضیلت حاصل کرنا ہو تو ہر طالب علم کو کم از کم سولہ سال کی محنت شاقہ اٹھانی پڑتی ہے۔ ڈاکٹر، انجینئر، وکیل بننے کے لئے سترہ سال کی تعلیم و تربیت کے بعد سند ملتی ہے۔ جس کے بغیر نہ کسی کو تدریس کی اجازت ہے نہ پریکٹس کی۔ —— پھر یہ کیسے باور کر لیا گیا ہے کہ علوم دینیہ میں تبحر دینی مدارس کے بغیر اور باقاعدہ تعلیم و تدریس کے بغیر از خود محض ذاتی (CASUAL) بے قاعدہ مطالعہ سے یوں ہی حاصل ہو سکتا ہے، جبکہ یہاں ایم۔ اے کی طرح کسی ایک مضمون میں تخصص کافی نہیں —— بلکہ علوم دینیہ مشتمل ہیں۔ قرآن، حدیث، فقہ و تاریخ، فلسفہ وعلم الکلام، اور عربی زبان و ادب کے کم از کم دس مضامین پر

بعض حلقوں سے اس قسم کی آوازیں اٹھتی رہتی ہیں کہ علماء کرام کو وجہ معیشت کے لئے کچھ اور کرنا چاہئے۔ بظاہر یہ بڑی مستحسن بات ہے اور اگر ایسا ممکن ہو تو اس سے بہتر کوئی صورت نہیں۔ لیکن نہ ان غریبوں کے ذاتی زمیندارے ہیں جن کے مربعوں سے آمدنی ہوتی ہو نہ قدیم اسلامی ریاستوں کی طرح حکومت نے مساجد اور مدارس دینیہ کے لئے جاگیریں وقف کی ہیں۔ نہ سرکاری مدارس کی طرح ان دینی مدارس کو ہزاروں لاکھوں کی سالانہ گرانٹیں ملتی ہیں اور دین کے ہر طالب علم کے لئے یہ بھی ممکن نہیں کہ وہ اپنی بے سروسامانی اور وسائل کے فقدان کے باوجود دینی علوم کا طویل نصاب پڑھنے کے بعد کسی اور پیشے یا فن کی تربیت حاصل کر سکے۔

پھر کبھی ہم نے کسی ڈاکٹر اور انجینئر سے یہ نہیں کہا کہ تم نے سرکاری کالجوں میں، سرکاری وسائل اور قومی وظائف سے تعلیم و تربیت حاصل کی ہے اپنے بزرگ اطباء کی طرح اعزازی خدمات انجام دو۔ اور وجہ معیشت کے لئے اور کوئی سبیل سوچو۔

میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ مستقل دینی مدارس کی ضرورت ہے، اور دین کی تعلیم و تبلیغ کے لئے ہمہ وقتی اصحاب کی ضرورت ہے جو اپنی زندگیاں اس مقصد عظیم کے لئے وقف کر دیں۔ —— اس حقیقت کی وضاحت کے لئے میں اپنی کسی دلیل کے بجائے کلام الٰہی سے ایک آیت پیش کرنا چاہتا ہوں۔

سورۂ توبہ کا آخری حصہ ہے۔ اس آیت سے قبل پوری سورۃ میں بلکہ اس سے پہلی سورۃ انفال میں بھی جہاد و قتال کے احکام ہیں۔ جہاد کی فضیلت اور قتال کی اہمیت کا بیان ہے۔ مجاہدوں غازیوں اور شہیدوں کے درجات کا ذکر ہے، جہاد سے منہ موڑنے والوں اور قتال فی سبیل اللہ سے گریز کرنے والوں کیلئے شدید وعید کے اعلانات ہیں۔ —— لیکن سورۃ کے خاتمہ کے قریب ارشاد ربانی ہے۔

وما کان المومنون لینفروا کافۃ فلولا نفر من کل فرقۃ منہم طائفۃ لیتفقہوا فی الدین و لینذروا قومہم اذا رجعوا الیہم لعلہم یحذرون

(التوبہ ۹ : ۱۲۲)

اور مومنوں کو نہ چاہئے کہ (جہاد کے لئے) سب نکل کھڑے ہوں، یہ کیوں نہ ہو کہ ہر گروہ میں سے ایک حصہ نکل کھڑا ہوا کرے، تاکہ باقی لوگ، دین کی سمجھ بوجھ حاصل کرتے رہیں تاکہ یہ اپنی قوم والوں کو جب وہ ان کے پاس لوٹ کر آئیں ڈراتے رہیں، عجب نہیں کہ وہ محتاط ہو جائیں۔"

خالق ارض و سماء نے جب جہاد جیسے مقدس فریضہ میں شرکت کے خواہشمندوں سے کہا ہو کہ وہ سب اس میں نہ لگ جائیں بلکہ ایک گروہ علم دین اور تبلیغ دین کے لئے جدا نکال لیں —— تو کیا آپ آج اسلام کی یہ پکار نہیں سن رہے ہیں کہ دنیا کی عیش کاموں میں سرد ست مسلمانو! تم میں سے ایک جماعت کیوں نہیں نکلتی جو اپنے آپ کو علم دین کی تحصیل اور تبلیغ اسلام کے لئے وقف کر دے۔

وما علینا الا البلاغ

جناب پروفیسر محمد حسن صاحب عسکری

ظاہری حالات تو یہی بتاتے ہیں کہ اب دنیا سے شعر و ادب کا چل چلاؤ ہے، عموماً لوگ اس کی توجیہ یوں کرتے رہتے ہیں کہ سنعت اور صنعت کاری کے مقابلہ میں ادب کا ٹھیرنا مشکل ہے، لیکن آج کل ہم یہ تماشا بھی دیکھ رہے ہیں کہ یورپ اور امریکہ میں ہزاروں نوجوان سائنس اور صنعت دونوں سے بیزار ہوتے جا رہے ہیں، لیکن احتجاج اور ردِ عمل کے جو طریقے انھوں نے نکالے ہیں وہ بھی شعر و ادب کے دائرے سے باہر ہیں، اور ان میں سے بعض جس قسم کے ادب کو اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ اسے ادب سمجھنا مشکل ہے اس سے پتہ چلا کہ سائنس اور صنعت کے علاوہ بھی کوئی اور چیز ہے جو یا تو شعر و ادب کو ہلاک کر چکی ہے یا آہستہ آہستہ ہلاک کر رہی ہے۔

مگر مغرب میں ابھی تک ہزاروں آدمی اور سیکڑوں دانشور ایسے باقی ہیں جنھیں ادب سے بڑی عقیدت اور محبت ہے اور انھیں ادب کی موجودہ صورت حال پر افسوس بھی ہے اور وہ ادب کو انسان کے لئے ضروری اور لازمی بھی خیال کرتے ہیں، اس عقیدت کی بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ "تہذیب" کو بجائے خود و بنفسہ قابل قدر سمجھتے ہیں، اور اس سے آگے یا ادھر انھیں کوئی چیز نظر نہیں آتی، موجودہ حالات سے ایسے لوگوں کو پریشانی ہونی ہی چاہئے مگر ایسے دانش ور اپنی پریشانی کا اظہار تو کرتے ہیں لیکن یہ حالات کیوں اور کیسے پیدا ہوئے اس کی کوئی تسلی بخش توجیہ نہیں کرتے۔

مثال کے طور پر ہربرٹ ریڈ ہیں۔ یہ مثال اس لئے موزوں ہے کہ پہلی جنگ عظیم کے بعد سے وہ انگریزی زبان کے دائرے میں "جدید فنون" کے سب سے بڑے مبلغ رہے ہیں۔ آجکل کے نوجوان جس قسم کا ادب اور مصوری پیش کر رہے ہیں اس کے متعلق انھوں نے سخت ناپسندیدگی بلکہ خفگی کا اظہار کیا ہے۔ ان کا احتجاج بالکل بجا ہے۔ لیکن ایک بات پر انھوں نے سرے سے غور ہی نہیں کیا۔ جن لوگوں پر انھیں اعتراض ہے وہ اپنی حماقتوں کے جواز میں لفظ بلفظ وہی اصول پیش کر سکتے ہیں جن کی تبلیغ ہربرٹ ریڈ پچھلے پچاس سال سے کرتے رہے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ان کے اصولوں سے جو عواقب اور مظاہر پیدا ہوئے ہیں وہ تو انھیں پسند نہ آئے، مگر اپنے اصولوں کی درستگی پر انھیں ذرا سا بھی شبہ نہیں ہوا۔

ادب کیا ہے؟ لیکن انصاف کی بات یہ ہے کہ ان

اصولوں کی منطق تو بھی مظاہر پیدا کر سکتی ہے۔ پچھلے دو ڈھائی سو سال سے مغرب کے مفکر لفظاً یا معناً یہی کہتے رہے ہیں کہ ادب اور فن انسانی جذبے کے اظہار کا ذریعہ ہے۔ زمانہ اور ترقی کر گیا تو لوگ جذبے کے بجائے جبلت، پھر انفرادی یا اجتماعی لاشعور کا ذریعۂ اظہار کہنے لگے۔ اور اس اظہار میں طرح طرح کے نفسیاتی، معاشرتی اور تہذیبی فائدے ڈھونڈنے لگے۔

مگر سوال یہ ہے کہ جذبے یا جبلت یا لاشعور کو اپنا اظہار ہی کرنا ٹھیرا تو پھر اظہار کی ایک خاص شکل یعنی شعر و ادب یا فن یا ادب کا کوئی خاص اسلوب ہی کیوں لازمی ہو؟ اگر اظہار کی کوئی اور شکل دستیاب ہو گئی ہے تو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟ بلکہ اگر مغرب کے دانش وروں کا یہ خیال درست ہے کہ انسان اب زبان کے وسیلے سے بھی بے نیاز ہوتا جا رہا ہے اور انسانی زبان مر رہی ہے تو یہ بھی ایک خوش خبری ہے، چونکہ ہمارے زمانہ میں یہ بھی رواج ہے کہ معاشرہ ہو یا تہذیب یا مذہب، ہر چیز کی حیاتیاتی تشریح کی جائے۔ بلکہ ایسی تشریح کو حتمی دلیل سمجھا جاتا ہے، اس لئے ہربرٹ ریڈ صاحب نے تو یہ بھی معلوم کر لیا تھا کہ ادب اور فن کی جڑ حیاتیات میں ہے، اور ادب انسان کے ارتقا کا ایک لازمی وسیلہ ہے۔ لیکن اگر اب ارتقا کی قوتوں نے کوئی نیا وسیلہ تلاش کر لیا ہے اور پرانے وسیلے کو چھوڑ دیا ہے تو نظریۂ ارتقا کے ماننے والوں کے لئے اعتراض کی گنجائش نہیں۔

غرض عمرانیات، نفسیات اور حیاتیات میں تو ادب کو باقی رکھنے کا کوئی لازمی جواز ملتا نہیں، مگر انسان کی ضد کو کیا کیا جائے۔ بعض لوگ اب بھی اکبر الٰہ آبادی کے بقول

ع "اس پر اڑے ہوئے ہیں کہ گولر کا پھول لیں گے"

کہتے یہ ہیں کہ ارتقا تو نہ صرف ناگزیر ہے بلکہ سب سے گراں قدر چیز ہے، لیکن انسان کو اپنے ماضی یا اپنی "روایت" سے بھی کچھ نہ کچھ تعلق قائم رکھنا چاہئے۔ یہ دعوی بھی بے دلیل ہے۔ لیکن خیر، ایک جذباتی مطالبے کے طور پر اسے قبول کر لیتے ہیں

اب دیکھنا یہ ہے کہ "روایت" کیا چیز ہے؟

روایت کیا ہے؟

مشرق کی حد تک تو مسئلہ بالکل واضح ہے، مسلمان ہوں یا ہندو یا بدھ سب کا اتفاق دو چیزوں پر تو ہے ہی۔ پہلی بات یہ ہے کہ معاشرتی روایت، ادبی روایت، دینی روایت یہ الگ الگ چیزیں نہیں بلکہ ایک بڑی اور واحد روایت ہے جو سب کی بنیاد ہے اور باقی چھوٹی روایتیں اسی کا حصہ ہیں اور اسی سے نکلی ہیں۔ اسلامی اصطلاح کے مطابق اس بنیادی روایت کا نام "دین" ہے۔ ثانوی روایتوں کیا شامل ہونے کے لئے اس بنیادی روایت میں شامل ہونا لازمی ہے، دوسری بات یہ ہے کہ بنیادی روایت نکلتی ہے کسی آسمانی یا مقدس کتاب سے، پھر اس کی وضاحت کرتے ہیں اس روایت کے مستند نمائندے، اور صرف انھیں نمائندوں کا قول استناد کے قابل ہوتا ہے، پھر ایک تیسری بات ہے جو ہر زبان میں خود لفظ "روایت" کے مفہوم کا لازمی جز ہے۔ یعنی روایت وہ چیز ہے جو ایک آدمی سے دوسرے آدمی تک پہنچائی جائے۔

لیکن مغرب میں ہر چیز الٹی ہو گئی ہے۔ اول تو وہاں مرکزی اور بنیادی روایت کا تصور ہی تقریباً غائب ہو گیا ہے لوگ معاشرتی روایت، ادبی روایت، یہاں تک کہ کھیلوں کی روایت کا ذکر اس طرح کرتے ہیں گویا یہ سب الگ الگ چیزیں ہیں اور اپنے اپنے دائرے میں عمل کرتی ہیں لیکن اگر کسی کو مرکزی روایت کی ضرورت کا خیال آیا بھی تو وہ معاشرتی روایت کو یہ حیثیت دیتا ہے اور دینی روایت کو معاشرتی روایت کا ایک جزو بتاتا ہے۔ اس معاشرتی روایت کا نام مغربی لوگوں نے "کلچر" رکھا ہے، لیکن اگر ہم کسی معاشرت کے دائرے میں روایت کا وجود مان لیں تو ایسی روایت کا انحصار کسی آسمانی کتاب پر ہونا ضروری نہیں۔ اس دائرے میں تو روایت کے معنی رسم اور رواج ہی کے ہو سکتے ہیں۔ رواج بدلتی رہنے والی چیز ہے، اس لئے اول تو

یہی کیا ضروری ہے کہ کسی خاص قسم کی رسم کو زندہ رکھا جائے ایک رسم اتنی ہی اچھی یا بری ہو سکتی ہے جتنی دوسری رسم ۔ رہا سوال کسی خاص رسم سے جذباتی وابستگی کا تو جذباتی علاقے بھی کوئی مستقل چیز نہیں ۔ جذبات تو دن میں دس بار بدل سکتے ہیں ۔ دوسرے رواج کے معاملے میں قابل استناد نمائندوں کا مستقل طور پر موجود ہونا اور ان کا تسلیم کیا جانا بھی ضروری نہیں یہی وجہ ہے کہ مغربی ادب کے دائرے ہی میں ہم یہ تماشا روز دیکھتے ہیں کہ جس شاعر یا اسلوب کو ایک آدمی روایت میں داخل کرتا ہے دوسرا اسی کو خارج کرتا ہو اگر "روایت" کا لفظ محض رواج کے معنی میں استعمال کیا جاتا تو بھی چلئے غنیمت تھا ۔ مغرب کے بعض مفکروں نے تو ایک قدم اور آگے بڑھایا ہے ۔ اور اس لفظ کے لغوی مفہوم تک کو نظر انداز کر دیا ہے ۔ یعنی انھوں نے یہ بھی ضروری نہیں سمجھا کہ روایت ایک شخص سے دوسرے شخص تک پہنچے ۔ ایم سی بریڈ برک انگریزی ادب کی مشہور عالم اور نقاد ہیں ، وہ ایک جگہ کہتی ہیں کہ سولھویں صدی کے آخر میں فلاں شاعر نے ایک "روایت" شروع کی جس کی پیروی بیس سال تک ہوئی ، فلاں شاعر نے دوسری "روایت" کی طرح ڈالی جس کی تقلید صرف پانچ چھ سال ہوئی ، فلاں شاعر نے ایک اور "روایت" نکالی جس کی پیروی کسی نے بھی نہ کی ۔

اس بحث کا خلاصہ یہ نکلا کہ مغرب کے عقلاء روایت کو زندہ بھی رکھنا چاہتے ہیں اور یہ بھی نہیں بتا سکتے کہ روایت ہے کیا چیز ۔ انگریزی ادب میں روایت کے سب سے بڑے دعویدار ٹی ایس ایلیٹ ہیں ۔ انھوں نے تو یہاں تک دعویٰ کیا ہے کہ یورپ نے اپنی تہذیبی روایت کے سارے اہم عناصر کو محفوظ رکھا ہے اور ایک جزء بھی ضائع نہیں کیا ۔ وہ ادب میں یسوعی روایت کا سب سے بڑا نمائندہ اطالوی شاعر دانتے کو سمجھتے ہیں ۔ اس شاعر نے ایک رسالہ مقامی زبانوں میں شعر کہنے کی ضرورت کے متعلق لکھا ہے ۔ کم سے کم مغربی عالموں کی نظر میں اس رسالہ کا مفہوم یہی ہے اور اسی لئے اس تحریر کو انقلابی اہمیت کا حامل خیال کیا جاتا ہے ۔ ڈانٹے نے کہا ہے کہ سب سے اچھے شاعر وہ ہیں جو تین زبانوں میں شعر کہتے ہیں ، اور ساتھ ہی اچھے شاعروں کی فہرست بھی دی ہے ۔ مغرب کو اپنی تحقیق پر بڑا ناز ہے ، لیکن محققین نے یہ دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں فرمائی کہ اس فہرست میں ایک بھی ایسا شاعر نہیں جس نے بیک وقت تین زبانوں میں شاعری کی ہو یہ بات بھی ایک مسلمان صوفی نے بتائی ہے کہ یہاں تین زبانوں سے تین قسم کے مطالب مراد ہیں ۔ اگر یورپ کی روایت واقعی محفوظ ہے تو کیا خود ٹی ایس ایلیٹ کو یہ رمز معلوم تھا ؟

ایلیٹ مغرب کے ان چند مفکروں میں سے ہیں جنھوں نے ادب کے مطالعہ کے لئے الٰہیات یا دینیات سے واقفیت کو ضروری قرار دیا ہے ۔ لیکن ایک دفعہ یہ بات کہنے کے بعد انھوں نے دوبارہ یہ ذکر ہی نہیں چھیڑا ، بلکہ وہ کتاب تک واپس لے لی جس میں یہ فقرہ لکھا تھا ۔ اس لئے یہ پتہ نہیں چل سکا کہ ان کے نزدیک ادب اور دین کا کیا رشتہ ہے ۔ البتہ فرانس میں ژاک ماری تیں نے سینٹ ٹامس اکوائناس کی الٰہیات سے ادب کے اصول اخذ کرنے کی مفصل کوشش کی ہے ۔ وہ کہتے ہیں کہ "اگر میں سینٹ ٹامس کی پیروی نہ کروں تو میری خرابی ہو"۔ لیکن جس شکل میں یہ پیروی ہوئی ہے اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ خرابی دراصل سینٹ ٹامس کی ہوئی ، کیونکہ ادب کے متعلق جو نظریئے بھی ہمارے زمانے میں رواج پا گئے ہیں وہ سب یا ان میں سے بیشتر انھوں نے اپنے سرپرست اور رہنما کی طرف منتقل کر دیئے ہیں ۔

لیکن مغرب کی ہمت قابل داد ہے ۔ ان تمام الجھنوں کے باوجود مغرب والے یہ کہے چلے جا رہے ہیں (کیونکہ مشرق میں مصرع اٹھانے والوں کی کمی نہیں ۔) کہ ہمارے پاس ایسے اصول ہمیشہ رہے ہیں جن کی مدد سے ہر ملک اور ہر زبان کے ادب کو سمجھا اور پرکھا جا سکتا ہے ۔ پچھلے تین سو سال کے

عرصے میں جو ادبی اصول مغرب نے نکالے ہیں ان کا مجمل سا
جائزہ تو اوپر پیش کیا جا چکا ہے۔ اب قدیم یورپ کو دیکھیے

شعر و ادب کی فلسفیانہ توجیہ

مغرب میں بہت سے لوگوں نے صاف الفاظ میں اعتراف کیا ہے کہ ادب کے
متعلق بنیادی نظریے تو افلاطون اور ارسطو ہی کے ہیں، بعد
میں تو کسی نہ کسی طرح انھیں کی الٹ پھیر ہوتی رہی ہے۔

افلاطون اور ارسطو کے نظریات میں بھی جوہری لفظ
Mimesis ہے۔ اصل لفظ نقل کرنے کی ضرورت
اس لئے پیش آئی کہ اس یونانی لفظ کے متعدد ترجمے ہوتے
ہیں۔ کسی نے کہا اس کے معنی ہیں نقل، کسی نے کہا عکاسی یا تصوّر
کشی، کسی نے کہا نمائندگی، کسی نے کہا اظہار، کسی نے اسے
تخلیق ہی بنا دیا۔ افلاطون نے تو اس تصور کو شاعری کے رد
کرنے کی غرض سے استعمال کیا ہے۔ اس لئے اگر صحیح معنی کا
تعین نہیں ہوتا تو نہ سہی۔ لیکن ارسطو نے اسی لفظ کو شاعری
کے اثبات اور قبول کی غرض سے استعمال کیا ہے، اس لئے
یہاں معنی کا تعین زیادہ لازمی ہے۔ چونکہ ہر مفکر اپنی تشریح کی
تائید میں یونانی لغت کا حوالہ دیتا ہے، اس لئے یوں تو فیصلہ
ہو نہیں سکتا۔ البتہ ایک اور طریقہ اختیار کیا جا سکتا ہے۔
افلاطون شاعری کو رد کرتا ہے۔ کیونکہ اس کے نزدیک شاعری
کے ذریعے حقیقت تک نہیں پہنچ سکتے۔ ارسطو شاعری کو
قبول کرتا ہے، کیونکہ اس کے نزدیک شاعری کے ذریعے
حقیقت تک پہنچ سکتے ہیں۔ اب اگر ہم یہ معلوم کر لیں کہ یہ حقیقت
کیا چیز ہے تو پھر یہ بھی پتہ چل جائیگا کہ اس حقیقت کی نقل
ہو سکتی ہے یا عکاسی یا نمائندگی، یا کچھ بھی نہیں۔ ارسطو اور
دوسرے یونانی فلسفیوں کے نزدیک سب سے بڑا علم ما بعد الطبیعیات
Metaphysics ہے۔ اگر اس لفظ کے لغوی معنی
سامنے رکھیں تو یہ درست ہے، کیونکہ اس سے مراد ہے ہر
وہ حقیقت جو طبیعیات سے آگے ہو۔ لیکن ارسطو نے یہ بھی کہا
ہے کہ ما بعد الطبیعیات کی سب سے اہم شاخ علم وجود ONTOLOGY
ہے۔ بلکہ ان دونوں کو مترادف قرار دیا ہے۔ اس کا مطلب
یہ ہوا کہ ارسطو اور یونانی فلسفیوں اور ازمنۂ وسطیٰ کے
عیسوی مفکرین کے نزدیک حقیقتِ عظمیٰ وجود ہے، اور
ان کی حکمت کی اڑان بس یہیں ختم ہو جاتی ہے۔ ایسی ہی
خامیوں کی وجہ سے حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ
نے یونانیوں کی الٰہیات اور ما بعد الطبیعیات کو ضلالت
قرار دیا ہے۔ اور کہا ہے کہ یونانی فلسفیوں سے زیادہ احمق
کوئی اور طبقہ نہیں ہوا۔ بلکہ یہاں تک فرمایا ہے کہ ان سے
بہتر تو وہ ہندو ہیں جو بتوں کو پوجتے ہیں۔

حضرت کا یہ فرمانا کس حد تک بجا ہے، اس کا اندازہ
آپ کو اس وقت ہو گا جب آپ حقیقتِ عظمیٰ کا اسلامی تصوّر
سمجھ لیں۔ حضرت مجدد صاحبؒ فرماتے ہیں ــــ "واجب
جل شانہ کی ماہیت اپنی خودی سے موجود ہے نہ کہ وجود
کے ساتھ۔ اور وجود کا اثبات اور وجوب کا اطلاق اسی
بارگاہ میں عقل کی منتزعات کی قسم سے ہے۔ وللہ المثل
الاعلیٰ۔ اور جس طرح وجوب وجود منتزعات کی قسم سے
ہے، امتناعِ عدم بھی اس بارگاہ میں منتزعات میں سے ہے
لیکن جہاں ذات بحث ہے وہاں جس طرح وجوبِ وجود کی
نسبت نہیں، امتناعِ عدم کی نسبت بھی نہیں"۔

(مکتوبات جلد سوم ۱۲)

وجود کا اس حقیقتِ عظمیٰ کے مقابلہ میں کیا درجہ ہے؟
فرماتے ہیں ــــ "وجوب وجود اس مقدس درگاہ کا کمینہ
خادم ہے اور سلب عدم اس بارگاہ بزرگ کا کمینہ خاک
روب ہے" (۱۲۱) ظاہر ہے کہ ایسی حقیقت کی نہ تو نقل
اتاری جا سکتی ہے نہ تصویر کشی اور عکاسی ہو سکتی ہے نہ نمائندگی
نہ اظہار۔ بس زیادہ سے زیادہ اس کی طرف اشارہ کیا جا سکتا ہے

جب اسلام کا تصورِ حقیقت یہ ہے اور اسلامی شاعری
کا فریضہ یہ ہے کہ اس حقیقت کی معرفت حاصل کرنے میں اپنی
بساط بھر انسان کی مدد کرے تو پھر ارسطو کے ادبی نظریات

ہماری شاعری کو سمجھنے میں کیسے مفید ہو سکتے ہیں۔ (ارسطو نے تو بادشاہ کی جگہ خادم کو بٹھانے کی کوشش کی ہے، بھلا جو احکام خادم کے لئے برمحل ہیں وہ بادشاہ کے لئے کیسے برمحل ہو سکتے ہیں) اسلامی روایت کے دائرے میں جو شاعری ہوگی اس کا آخری مقصد تو حقیقت عظمیٰ کی طرف اشارہ کرنا ہی ہوگا۔ البتہ حقیقت کی طرف چلنے میں جو منزلیں درمیان میں آئیں گی اُن کا بیان بھی شاعری کو کرنا پڑے گا۔ یہ منزلیں چار عوالم ہیں ـــ ناسوت، ملکوت، جبروت اور لاہوت جو بڑے شاعر ہوں گے وہ چاروں منزلوں سے گذر جائیں گے جو چھوٹے شاعر ہوں گے وہ بیچ کی کسی منزل تک پہنچ کے رہ جائیں گے۔ یہی حال اول درجے کے شعروں اور دوسرے درجے کے شعروں کا ہوگا۔ (یہاں یہ بھی عرض کر دینا مناسب ہوگا کہ ڈانٹے نے جو تین زبانوں میں شعر کہنے کا ذکر کیا ہے اس سے مراد بھی مدارج ہیں۔ عالم ناسوت سے متعلق شاعری کو وہ قابلِ اعتنا نہیں سمجھتا، علاوہ ازیں خود مغربی عالموں کی تحقیق کے مطابق ڈانٹے نے یہ علم "فتوحاتِ مکیہ" کے ذریعے حاصل کیا تھا)

غرض ارسطو کا نظریۂ شعر ہمیں عالم ملکوت یا زیادہ سے زیادہ عالم جبروت سے آگے نہیں لے جاتا۔ یہاں چاہے نقل کہہ لیجئے، چاہے عکاسی، چاہے اظہار سب برابر ہے۔ چنانچہ ارسطو کے نظریئے کی مدد سے ہم اسلامی شاعری کے بہت ہی تھوڑے سے حصہ کو سمجھ سکتے ہیں، اور وہ تھوڑا سا حصہ بھی ہماری اعلیٰ ترین شاعری کا نمونہ نہیں ہوگا۔ بلکہ ہمارے یہاں تو آپ کو یہ مشکل پیش آئے گی کہ معمولی شعر بھی وجود کے دائرے سے باہر نکلنے کے لئے پھڑکتا نظر آئیگا

داغ کو ارباب نشاط کا شاعر کہہ کر ٹال دیا جاتا ہے انہیں کا ایک مشہور بلکہ بدنام شعر دیکھئے۔

صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں
خوب پردہ ہے کہ چلمن سے لگے بیٹھے ہیں

کیا اس شعر کا ظہور اور خفا کے مسئلے سے کوئی تعلق نہیں؟ اسی طرح امیر مینائی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ کنگھی چوٹی میں پھنس کے رہ گئے تھے۔ فرماتے ہیں۔

وصل ہو جائے ابھی حشر میں رکھا کیا ہے
آج کی بات کو کیوں کل پہ اٹھا رکھا ہے

کیا یہ شعر رویت باری تعالیٰ کے مسئلے سے نہیں نکلا؟ مولانا حسرت موہانی مرحوم ظاہر و باطن دونوں میں دیندار مسلمان تھے۔ لیکن انگریزی تعلیم کا ایسا سایہ پڑا کہ شاعری کو عارفانہ عاشقانہ، فاسقانہ کے خانوں میں تقسیم کر گئے۔ سوال یہ ہے کہ ان دو شعروں کو کونسے خانوں میں ڈالا جائے گا؟

ان دو مثالوں سے ہی واضح ہو گیا ہوگا کہ جہاں تک صحیح معنوں میں ہماری روایتی شاعری کا تعلق ہے مغرب کا بلند سے بلند ادبی نظریہ ہمارے لئے مفید مطلب نہیں ہو سکتا ہماری روایتی شاعری تو خیر دور کی بات ہے، آج مغرب خود اپنے ازمنۂ وسطیٰ کی شاعری ہی نہیں سمجھ سکتا۔ بعض لوگوں نے تو تھک ہار کے یہ کہہ دیا ہے کہ اس دور کو شاعری کی تاریخ سے ہی خارج کرو۔ جو لوگ ذرا ایماندار اور حساس ہیں وہ اب یہ کہنے لگے ہیں کہ عربی شاعری اور خصوصاً حضرت ابن الفارض رح کے کلام کی مدد سے اپنی شاعری کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ اس قسم کی دو ایک کوششیں فرانس میں ہوئی بھی ہیں۔ اور پرانی مغربی تہذیب کے متعلق حیرتناک انکشافات ہوئے ہیں۔ لیکن فی الجملہ حضرت ابن الفارض رح کا کلام تو پوری طرح وہی سمجھ سکتا ہے جو انہیں کی روایت میں شامل ہو۔

یعنی وہی دین رکھتا ہو جو شاعر رکھتا تھا۔ بہرحال ایک فرق تو ضرور ہوا ہے، ابھی کچھ دن پہلے تک مغرب کے لوگ یہ کہا کرتے تھے کہ مشرق کی شاعری میں لفاظی اور مبالغہ آرائی کے سوا کیا ہے۔ خود ہمارے یہاں بھی یہ فیشن ہو گیا تھا کہ اچھے خاصے ثقہ لوگ اپنی قومی ہمدردی کے

باوجود "ایشیائی شاعری" کو صلواتیں سنانا فرض منصبی
سمجھتے تھے، حالی مرحوم جیسے متین آدمی یہ لکھ گئے۔ ؎

ہمارے قصائد کا ناپاک دفتر
عفونت میں سنڈاس سے جو ہے بد تر

اور انھوں نے یہ نہ سوچا کہ امرا کی شان میں جو قصیدے
ہیں ان میں بھی توحید کے کتنے مضامین بیان کئے گئے ہیں۔
لیکن آج یہ حال ہوا ہے کہ مثلاً انگریزی کے مشہور شاعر رابرٹ
گریوز نے عمر خیام کی رباعیوں کا ترجمہ کرنے کے بعد کہا ہے
کہ ہم انگریز لوگ تو جانتے بھی نہیں کہ اصلی شاعری ہوتی کیا
ہے۔ فارسی شاعری تو بڑی چیز ہے۔ جن دو چار فرانسیسیوں
نے اردو شاعری پڑھی ہے ان کے منہ سے بے ساختہ یہی نکلا
ہے کہ ہمیں تو اب پتہ چلا شاعری کسے کہتے ہیں۔

ادب اور دین کا رشتہ

مگر شبلی مرحوم اور حالی مرحوم
وغیرہ پر انگریزوں کی ایسی ہیبت طاری ہوئی تھی کہ انگریزی
ادب سے ابتدائی واقفیت کے بغیر انیسویں صدی کی انگریزی
تنقید سے دو چار چلتے ہوئے خیالات اخذ کر لئے، اور اپنے
ادب کو ان محدود تصورات میں اس طرح مقید کیا کہ آنیوالی
نسلوں کے ادبی فہم اور ادبی ذوق کو غارت کر گئے۔ سب سے
بڑا نقصان انھوں نے یہ پہنچایا کہ شعر کی بنیاد جذبات کو قرار
دے گئے اور شعر کی خوبی کا معیار خلوص جذبات کو بنایا۔
دوسرے شاعری کا سب سے بڑا مقصد اخلاقی اصولوں
کی ترویج ٹھیرایا۔ ان خیالات کو رواج دے کر ان حضرات
نے نہ صرف ہمارے ادب کو نقصان پہنچایا۔ بلکہ مسلمانوں کو
دینی نقصان پہنچایا۔ اللہ تعالیٰ ان کی اور ہم سب کی خطائیں
معاف کرے۔ انھوں نے یہ خیالات انیسویں صدی کی
انگریزی تنقید سے مستعار لئے تھے۔ لیکن خود انگریزی
تنقید میں یہ خیالات اس وجہ سے پیدا ہوئے کہ مغرب
میں مذہب کا زوال بہت دور پہنچ چکا تھا۔ انیسویں صدی
میں مغرب کے لوگ عموماً اور پروٹسٹنٹ لوگ خصوصاً یہ
اصولی بات بالکل بھول چکے تھے کہ مذہب میں سب سے
پہلی چیز عقائد ہیں، اس کے بعد عبادات اور پھر اخلاقی اصول
عقائد کی اہمیت تو ان لوگوں کی نظر میں بالکل ختم ہو گئی۔ اور
لفظ (Dogma) گالی کے طور پر استعمال
ہونے لگا، عبادات کو رسم کہا گیا۔ اب پروٹسٹنٹ لوگوں
کے پاس دو چیزیں رہ گئیں۔ اخلاقیات اور جذبہ۔ چنانچہ
بعض لوگ تو یہ کہنے لگے کہ مذہب کا مقصد بس اخلاقی تربیت
ہے اور کچھ نہیں۔ بعض لوگ کہنے لگے کہ انسانی جذبات کی
تسکین کے جتنے ذرائع ہیں ان میں مذہب سب سے لطیف
ذریعہ ہے۔ پھر آگے چل کر انھیں خیالات کو شعر و ادب پر
عائد کیا گیا۔ بلکہ ادب اور ادبی تنقید مذہب میں تحریف کرنے
اور مذہب کے صحیح تصور کو مسخ کرنے کا سب سے مؤثر ذریعہ
بن گئی۔ شبلی اور حالی اور ان کے ہم عصروں نے بڑی سادگی
کے ساتھ ان مغربی خیالات کو دانشمندی کا جوہر سمجھا۔
یہ سامنے کی بات بالکل نظر انداز کر دی گئی کہ اسلام میں،
ایمان یا معرفت انسانی جذبے کی کسی کیفیت کا نام نہیں
بلکہ ایمان اور معرفت عقل کل یا عقل معاد کے ذریعے حاصل
ہوتے ہیں۔ ایک حدیث میں عقل کا مقام قلب بتایا گیا ہے
خود قرآن شریف میں قلب کے ساتھ لفظ "یعقلون"
آیا ہے۔ چنانچہ جس شاعری کا مقصد ایمان کی تکمیل میں مدد
دینا ہو وہ عقل کلی کا ذریعۂ اظہار ہو گی، انسانی جذبات کا
نہیں ۔۔ یوں چاہے ثانوی درجے میں جذبات بلکہ جسمانیات
سے بھی کام لے لیا جائے۔ لہٰذا جذبات کو عقل کلی کے مقام
پر رکھنا نہ صرف ادبی لحاظ سے کج فہمی ہے بلکہ دین کے
خلاف ہے۔ رہا سوال خلوص جذبات کا، تو اخلاص کا دینی
مطلب حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی تحریروں میں
دیکھ لیا جائے، جہاں انھوں نے سیکڑوں بار عقلی اور طبعی
اختیاری اور غیر اختیاری کا فرق واضح کیا ہے۔ تو جس طرح
جذبات کا خلوص غیر شرعی چیز کو شرعی نہیں بنا سکتا، اسی طرح

صرف محض جذبات یا خلوص بھرے شعر کو اچھا شعر نہیں بنا سکتا، علاوہ ازیں تصوف کی اصطلاح میں "جذبے" سے مراد انسانی جذبہ نہیں، بلکہ خدا کا بندے کو اپنی طرف کھینچنا ہے۔ پھر اخلاقیات پر غلو کے ساتھ زور دینا اور تصوف کی شاعری کو صرف اخلاقی تعلیم کا ذریعہ سمجھنا یہ بھی شاعری اور دین دونوں میں تحریف ہے۔ یہاں ایک باریک فرق ہے جس کی وضاحت ضروری ہے۔ بہت سے صوفیائے کرام نے اور خصوصاً حضرت مولانا تھانویؒ نے تاکید کے ساتھ فرمایا ہے کہ تصوف کا اصلی مقصد اصلاح باطن ہے۔ اور یہی سارا تصوف ہے۔ جو لوگ انگریزی تعلیم سے متاثر ہیں وہ "اصلاح باطن" اور "اصلاح نفس" کو ایک ہی چیز سمجھتے ہیں۔ اور یہ غلط فہمی اب بہت ہی عام ہو چکی ہے۔ اس لئے بہت سے لوگ تصوف اور نفسیات کو ایک ہی چیز سمجھنے لگے ہیں۔ اور یہ ایسی غلطی ہے جس سے پناہ مانگنی چاہئے۔ حضرت مجدد صاحبؒ جلد سوم کے مکتوب ۵۲ میں تصریح فرماتے ہیں کہ جو چیز درکار ہے وہ اصلاح قلب ہے۔ اور یونانی فلسفیوں نے جو صفائی حاصل کی ہے وہ محض نفس کی صفائی ہے جو گمراہی کو زیادہ کرتی ہے۔ یونانی فلسفیوں کے پاس نفس کی صفائی کا تو نظام موجود تھا، انیسویں صدی کے مغربی مفکرین تو اس سے بھی خالی تھے۔ مگر انہیں کے تصورات کو قومی ہمدردی کے نام پر ہمارے یہاں پھیلایا گیا۔ اور یہ صرف شاعری کو دین سے الگ کر لینے کا نتیجہ تھا۔ دین کو اس طرح نقصان پہنچا ہو یا نہ پہنچا ہو، ہمارا ادبی شعور تو بہر حال غارت ہو گیا۔

اب سوال یہ ہے کہ پچھلے سو سال سے ہمارا جدید تعلیم یافتہ طبقہ دین سے بھی زیادہ شعر و ادب کا گرویدہ رہا ہے، پھر اس نے ادبی شعور کو کیسے غارت ہونے دیا یہاں ایک تو اس طبقے کی معذوری ہے۔ جو لوگ مغربی خیالات کی ترویج کر رہے تھے وہ صورتاً ثقہ تھے، اس لئے انگریزی پڑھنے والوں نے انہیں کو اپنی روایت کا مستند نمائندہ سمجھا۔ اب الزام اصلی نمائندوں پر آتا ہے کہ انہوں نے ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کو بے سہارا کیوں چھوڑ دیا؟ لیکن انیسویں صدی میں ہمارے علماء اپنے اصلی اور بنیادی کام میں مصروف تھے، یعنی دین کی حفاظت میں، اور اس کا بڑا ذریعہ تھا دینی علوم کو اردو زبان میں منتقل کرنا۔ ان کے کارنامے کی نوعیت سمجھنے کے لئے ہندو مصنفوں کی شہادت نظر میں رکھنی چاہئے انیسویں صدی کے آخری پچاس سال میں بہت سے ہندوؤں نے اپنے دین پر اردو میں کتابیں لکھی ہیں، ان میں سے ہر مصنف رشک و حسد کے ساتھ یہ کہتا دکھائی دیتا ہے کہ مسلمان بڑے خوش قسمت ہیں جو اپنے دین کو اردو زبان کے ذریعے حاصل کر سکتے ہیں۔ اور ہندو اپنی مقدس کتابوں کے ناموں سے بھی واقف نہیں۔ تو ہمارے مستند علماء اپنے بنیادی فریضے کی تکمیل میں لگے ہوئے تھے، ادب جیسی ثانوی چیزوں کی طرف توجہ کرنے کی انہیں فرصت نہیں تھی۔

لیکن یہ بات بھی پوری طرح صحیح نہیں۔ الزام دراصل ادب کے پرستاروں پر ہی آتا ہے۔ شبلی اور حالی کے زمانے میں ہی تصوف پر ایسی کتابیں لکھی گئیں ہیں جن میں "نیچرل شاعری" کے دلدادگان کو خاص طور سے مخاطب کر کے شعر کی اصلیت شاعری کے مقاصد اور اصول سمجھائے گئے ہیں۔ لیکن جب کسی میں طلب ہی نہ ہو تو کہنے سے بھی کچھ حاصل نہیں۔

حضرت تھانویؒ کی ادبی تنقید پھر حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی شرح غزلیات حافظ اور شرح مثنوی مولانا روم عرصے تک رسالوں میں قسط وار شائع ہوتی رہی ہے حضرت کا مقصد تو خیر دینی تھا لیکن جو چاہے صرف ان حو

کتابوں سے شاعری کی پوری تعلیم اخذ کرسکتا ہے۔ بلکہ جو شخص بھی صحیح معنوں میں روایتی شاعری سے آگاہی حاصل کرنا چاہے اس کے لئے موجودہ حالات میں واحد ذریعہ یہی دو کتابیں ہیں۔

غرض جن حضرات کو ہماری دینی روایت کی نمائندگی کا واقعی حق حاصل تھا ان کی تائید اور حمایت سے ادب جیسی ثانوی چیز بھی محروم نہیں رہی۔

پھر یہ بھی نہیں کہ مولانا تھانوی رحؒ نے اردو شاعری کو قابل اعتنا نہ سمجھا ہو۔ حضرت کے مواعظ میں، ملفوظات میں اور دوسری تحریروں میں جابجا ایسے اشارے ملتے ہیں جو درحقیقت پوری کتاب ہیں، جو لوگ ادبی نقاد سمجھے جاتے ہیں ان کی لمبی چوڑی تحریروں میں اردو شاعری کے متعلق ایسے حقائق ڈھونڈے سے بھی نہ ملیں گے۔ یہاں اس موضوع پر پوری بحث تو ممکن نہیں۔ صرف ایک مثال پیش کی جاتی ہے عقلمندوں کے لئے وہی کافی ہوگی۔

کہا جاتا ہے کہ مومن کی اہمیت سے لوگ اس وقت واقف ہوئے ہیں جب نیاز فتحپوری نے ان کی طرف توجہ دلائی۔ مگر حضرت مولاناؒ کہہ چکے ہیں کہ دہلی کے شاعروں میں جذبات مومن میں ہیں وہ اوروں میں نہیں، اسی طرح امیر مینائی کے کلام کی وہ تعریف کی ہے جو آج تک ادبی نقاد نہیں کر سکے مطالب اور مضامین کے سلسلے میں حضرت رنگینی اور سنگینی کا فرق بہت زور دیتے ہیں، یہ فرق سمجھنے کے لئے پہلے غالب کا یہ شعر ملاحظہ فرمایئے

کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیر نیم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

حضرت مولانا تھانوی رحؒ نے اس شعر کی یہ خامی بتائی ہے کہ غالب نے صرف ظاہری حالت کو نظر میں رکھ کر شعر کہدیا ہے، حقیقت کو نہیں دیکھا اگر کسی کے جسم میں تیر لگے تو واقعی وہی حال ہوگا جو غالب نے دکھایا ہے۔ مگر عشق حقیقی میں تو جتنا علاقہ بڑھتا جائیگا خلش بھی اتنی ہی بڑھتی جائے گی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالےٰ سے قرب بھی مجھ ہی کو تم سے زیادہ حاصل ہے۔

. . . . اور اللہ تعالےٰ سے خوف بھی مجھے ہی زیادہ ہے۔ یہ حال تو ہوا غالب کی رنگینی کا۔ اتفاق سے ذوق کا بھی ایک شعر اسی مضمون کا مل گیا۔ اب سنگینی دیکھئے۔

خدنگ یار مرے دل سے کس طرح نکلے
کہ اس کے ساتھ ہے اے ذوق میری جان لگی

ساتھ ہی ذوق کے تین شعر اور دیکھئے جس میں سنگینی کے ساتھ ایسی رنگینی ہے جو غالب کو نصیب نہیں ہوئی۔

تامل کیجیو ذوقِ طپیدن دیکھئے کیا ہو
کہ اب تک ذبح کرنے کا نہیں قاتل کو ڈھب آیا

ہلائے لب نہ بہرِ آفریں ہم نے تہِ خنجر
کہ قاتل بدگماں ہے جانے اپنے جی میں کیا سمجھے

ترے ڈر سے نہ آیا پاس کوئی نیم جانوں کے
مگر رونا کبھی چپکے سے بعد از نیم شب آیا

غالب کے یہاں منصور کا مضمون بار بار آیا ہے مثلاً

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
ہم کو تقلیدِ تنک ظرفیٔ منصور نہیں

اسی مضمون کو ذوق وہاں لے گئے ہیں جہاں تک غالب کی رسائی نہیں ؎

سمجھ یہ دار و رسن تار و سوزن اے منصور
کہ چاک پردہ حقیقت کا ہیں رفو کرتے

اسی طرح قطرہ و دریا کا مضمون غالب کو عزیز ہے۔ لیکن ذوق کو مضمون کے ہر پہلو پر جو گرفت حاصل ہے اس کا نشان تک غالب کے پورے کلام میں نہیں ملتا۔

کیوں کر حباب ہوسکے دریائے بیکراں
دریا سے جب تلک نہ ملے ٹوٹ پھوٹ کے

اب ذوق کا ایک آخری شعر اور سن لیجئے جس سے ارسطو اور سارے مغربی فلسفیوں کی بنیادی خامی اور ان کے ادبی نظریوں کی ناپختگی، اور اس کے مقابلے میں ہمارے

ادب کی جامعیت اور ہر چیز روشن ہو جائے گی ، بلکہ اس مضمون میں جتنی معروضات پیش کی گئی ہیں ان کے ثبوت کیلئے یہ شعر کافی ہے جس کا مضمون ذوق نے براہ راست قرآن شریف سے لیا ہے ۔

احاطے سے فلک کے ہم تو کب کے
نکل جاتے مگر رستہ نہ پایا

ان اشعار پر تبصرہ کی یہاں گنجائش نہیں ۔ مگر امید ہے کہ ان اشعار کی مدد سے مولانا تھانویؒ کے فقرے کا مطلب سمجھ میں آسکے گا ۔ اور یہ بھی اندازہ ہو جائے گا کہ جدید تعلیم پانے والوں نے ہماری دینی روایت کے مستند بنیادی ماخذ کا دامن چھوڑ کر تہذیب اور ادب کے میدان میں بھی کیا کچھ کھو دیا — اور یہ جو کچھ "اتنی بڑی چیز ہے کہ اس کے مقابلہ میں مغرب کا ادب بغیر کسی مبالغے کے محض بچوں کا کھیل ہے ۔

مگر یہ نقصان ایسا نہیں جس کی تلافی نہ ہو سکے ، ہماری دینی روایت بحمداللہ زندہ ہے ، اور ایسی زندہ ہے کہ دنیا کی کوئی روایت اس طرح زندہ نہیں ، اور قیامت تک زندہ رہے گی ۔ جو حضرات " اردو ادب کی روایت " کی فکر میں گھلتے ہیں ، اب یہ ان کا کام ہے کہ پہلے " روایت " کے معنی تو دریافت کرلیں ۔

چند خوانی حکمت یونانیاں　　حکمت ایمانیاں راہم بخواں

(بقیہ "فلم خانۂ خدا" ابھی ان مسلمانوں کی تعداد کروڑوں پر مشتمل موجود ہے ، جنہوں نے تقسیم ملک سے پہلے "برطانوی ہند" کی "حج فلم" کی شہرت سنی ، اور لاہور ، لائلپور ، امرتسر اور دہلی میں اس لعنت کے خلاف احتجاجی مظاہرے دیکھے اور بالآخر دینی عناصر کے شدید احتجاج پر اس فلم کے اجازت نامے کی دھجیاں فضائے بسیط میں بکھری مشاہدہ کیں ۔ لیکن اب پاکستان میں اسلامی غیرت کی یہ موت کہ مسلمانوں بلکہ بعض مسلم علماء کے ایما پر "فلم سنسر بورڈ" ہی دین کو لہو و لعب بنانے کے اس اقدام کو "سند جواز" عطا کرتا ہے حاجی قسم کے فلم انڈسٹریز کے مالک اس کی تشہیر کرتے ہیں مسلمان کہلانے والے اخبارات اس فلم کے اشتہارات شائع کرتے ہیں مسلم وزیر فلم انڈسٹریز کے زیر سایہ فلم شہر شہر دکھلائی جارہی ہے اور اسلام کی ترجمانی کے دعویدار اس پر عالم گو مگو میں معطل پڑے دکھائی دیتے ہیں — "یالیتنی مت قبل ھذا وکنت نسیاً منسیا" ۔

ہم جہاں تمام متعلقہ عناصر سے یہ شدید ترین مطالبہ کرتے ہیں کہ دین کو کھیل تماشہ بنانے والے اس عمل کو ایک لمحہ کی تاخیر کے بغیر ختم کیا جائے ، فلم خانہ خدا کا اجازت نامہ منسوخ کیا جائے اور آئندہ کے لئے قانوناً شعائر اسلامی کی فلم سازی کو ناجائز قرار دیا جائے وہاں دین کے علمبرداروں کو اس لرزہ خیز لمحہ کی جانب متوجہ کرتے ہیں جب غیور خدا ان سے دین کو لہو و لعب بنانے والے اقدامات کے خلاف اظہار احتجاج نہ کرنے پر ان کے خلاف فیصلہ صادر فرمائے گا ۔"

• ضالۃ المؤمن •

"جو شخص اجتماعی زندگی میں قدم رکھتے وقت مذہب کو بالائے طاق رکھ دیتا ہے وہ اس احمق کی طرح ہے جو کانٹوں پر چلنے سے پہلے اپنے جوتے اتار دے ۔"　(سیسل)

"اپنے آپ پر قابو پانے کے لئے دماغ استعمال کرو ، اور دوسروں پر قابو پانے کے لئے دل"　(ریڈرز ڈائجسٹ جون ۱۹۶۳ء)

"ہر جاڑے میں مجھے تعجب ہوتا ہے کہ لوگ دیہات میں کیوں رہتے ہیں ؟ اور ہر گرمی میں مجھے اس کا سبب معلوم ہو جاتا ہے"　(ہولا کاہر)

"ہم لوگ فرار کو آزادی سمجھتے ہیں ، خواہ یہ فرار فرائی پان سے آگ کی طرف کیوں نہ ہو ۔"　(ایرک ہافر)

"چیلیں بلندی پر ہوا کے ذریعہ نہیں ۔ ہوا کے خلاف اڑتی ہیں"　(سرونسٹن چرچل)

سخن راست

خواجہ محمد شفیع دہلوی

پردہ داری می کند برطاقِ کسریٰ عنکبوت
بوم نوبت می زند بر گنبدِ افراسیاب

کونسی سلطنت رہ گئی اور کونسی حکومت۔ کتنے سر تاجدار خاک میں ملے اور کتنی سلطنتیں پاش پاش ہوئیں ——— اسی طرح ہم بھی بامِ عروج تک پہنچے پھر روبہ زوال ہوئے لیکن ہمارے عروج کی بلندیاں اپنی ہیٹس سنبھال کر دیکھو تو انصاف تم کو مجبور کرے گا کہ ہمارے سامنے تعظیماً اپنی ہیٹ اتارو ——— ہم نہیں کہتے کہ صرف ہمارے عروج کو دیکھو بے شک ہمارے زوال پر بھی نظر ڈالو لیکن انصاف کا دامن ہاتھ سے نہ دو۔ ہمارا عروج کس درجہ اخلاقی بلندیوں کا حامل تھا اور کتنا طویل! اس کے مقابلہ میں ہمارا زوال اپنی پستی میں ان اخلاقی پستیوں کا حامل نظر نہیں آئے گا، جن گہرائیوں تک جن انتہاؤں تک سرکار پہنچے ہیں۔ اسلام تھا اور محض اسلام جس نے اہلِ دین کی بلندیوں کو تاجِ خلاق سے نوازا اور جب ہم اپنے اعمال اور حالاتِ روزگار کی وجہ سے روبہ زوال ہوئے تو ہمارے اخلاق کو سہارا دئے رکھا ——— صحیح عقیدہ ایک مستحکم بنیاد ہے جو عمارت کو کبھی تحت الثریٰ تک نہیں دھسنے دیتی۔ کنگرہ گرتے ہیں۔ بام منہدم ہوتے ہیں۔ دیواریں ڈھتی ہیں چھتیں سروں پر آ رہتی ہیں لیکن مضبوط، استوار اور صحیح عقیدہ کی بنیاد عمارت کو مسمار نہیں ہونے دیتی۔ بنیادیں پا برجا رہتی ہیں قوم میں معمار پیدا ہوتے ہیں، ساری قوم چونا گارا اور اینٹیں ڈھونے لگتی ہے اور عمارت پھر کھڑی ہو جاتی ہے، گنبد بھی تعمیر پا جاتے ہیں اور کلس بھی سربلندی دکھانے لگتے ہیں ——— زیادہ دور نہ جایئے۔ آج سے بیس سال پہلے غیر منقسم ہندوستان کی جانب مڑ کر دیکھئے۔ ہم گئے گذرے مسلمان۔ بدنام کنندہ نکونامے چند جن کو گنگ و جمن گومتی اور چناب۔ راوی اور ستلج کی زرخیز وادیوں نے نرم و نازک بنا دیا تھا جب ہم نے کلمۂ طیبہ کا سہارا لیا۔ اللہ کا نام لے کر اٹھے تو تاریخ عالم میں معجزہ کر دکھایا۔ ہم تو وہ تھے کہ اسلام ہم سے شرمسار تھا اور ہمیں خود کو مسلمان کہتے حجاب محسوس ہوتا تھا بشرکوں کے قرب اور ان کے خلا ملا نے ہمارے وحدت پرست کردار کو گھن کی طرح کھا لیا تھا۔ ذات پات کے پرستاروں کے دوش بدوش شب و روز گذارنے کی وجہ سے ہم مرکزیت کو فراموش کر چکے تھے، تاہم کلمہ گو تھے۔ اللہ نے ہم کو ایک مخلص سربراہ عطا فرمایا۔ ہم نے اس کی آواز پر لبیک کہی ہندوستان کی ساری ملت یکجا فردِ واحد کی طرح کھڑی ہو گئی، منزلِ مقصود کی طرف گام زن ہوئی، ہر قسم کی قربانیاں دیں، اور مدعائے دلی حاصل

کرلیا اور انشاء اللہ ابھی اور جو آرزوئیں باقی ہیں وہ بھی حاصل کرکے رہیں گے۔ السعی منی والاتمام من اللہ۔ آج تاریخ عالم اپنے پراگندہ اوراق جمع کرے۔ ان کا ایک ایک حرف پڑھے اور ایک ایک لفظ اور ایسی مثال پیش کردے تو ہم جانیں ہم نے پاکستان لا سے شروع کیا اور الا اللہ کے سہارے بام عروج تک پہنچایا۔ اس بیس سالہ حیات میں دشمنوں نے اپنی سی کیا کچھ نہ کرلی؟ بین الاقوامی سرحدوں کا بھی احترام نہ کیا، جب کشمیر کی وادی میں بدترین شکست سے دوچار ہوگئے اور اپنی افواج محصور ہوتی نظر آئیں تو اپنی پسند کا محاذِ جنگ منتخب فرمایا اور منہ کی کھائی ——— ہم غرور و تکبر کی باتیں نہیں کررہے ہیں ہم صرف اتنا بتانا چاہتے ہیں کہ جس رب کے ہم پرستار ہیں اس رب نے ہم کو ایسا دین عطا فرمایا ہے جو معجزنما کردار پیدا کرتا ہے اور کرتا رہے گا۔

عزیزان من مسلمان یہ اونٹوں کا حدی خواں سوتا کبھی نہیں اپنے مشاغل بدلتا ہے کبھی تیغ وسناں در دست میدان کارزار میں ہوتا ہے تو گاہ جام و مینا بہ کف بزم رنگ و بو میں مسلمان آتش فشاں پہاڑ ہے جو مردہ کبھی نہیں پایا گیا اس کے لاوے کے بہنے کی شکلیں بدلتی ہیں کبھی بشکل خونِ تازہ بہتا ہے تو کبھی بصورت مئے گل رنگ ——— اغیار اس بھید کو جانتے ہیں بس سدا سے ان کی دو کوششیں ہیں، ایک تو یہ کہ اس کے مادہ کو رنگ خون نہ اختیار کرنے دیں، اور دوسری یہ کہ اس کی روح کی گہرائیوں میں جو آتشِ طور روشن ہے اسے جس طرح ممکن ہو بجھادیں۔

نورِ خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن
پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

اس شب زندہ دار کی آنکھ کبھی جھپکی نہیں۔ گاہ ساری ساری رات داد نشاط دیتا ہے گاہ پوری پوری شب داد جہاد۔ مسجدوں میں سر جھکاتا ہے اور میدان میں سر کٹاتا ہے غرض کہ ہر عنوان اس کی حیات بعنوان شہادت وجود خداوندی ہے

——— یہ ضیغم اپنی اور پرائی شیرنیوں سے صرف نشاط تھے، چالاک دغاباز شکاری نے اپنے جال میں پھانس لیا اسے خبر بھی نہ ہوئی، یہ مشغولِ اختلاط رہا، جوں ہی احساس قید و بند ہوا غرایا دو منہ مارے اور اپنے کو آزاد کرلیا چند سال قبل عالم اسلام پر اکثر و بیشتر اغیار کا تسلط تھا، آج نہ یہ شکاری ہیں نہ ان کے جال ——— یقین جانئے اگر مسلمان نہ ہوتے تو ہندوستان بھی آزاد نہ ہوتا، ہندوستان کی دیگر اقوام کو تاریخ میں کبھی آزادی کا منہ دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ آریہ آئے اور قابض رہے، پھر پٹھان آئے، ترک آئے، مغل آئے وہ حاکم تھے اور یہ محکوم، حتیٰ کہ انگریز کا دور شروع ہوا۔ اب مسلمان بھی اس قید و بند میں ان کے شریک تھے اس آزاد منش و آزاد فطرت نے اپنی زنجیریں بھی توڑ ئیں اور دیگر باشندگان ہند کو بھی آزادی سے ہمکنار کردیا ع

ہم کو دعائیں دو تمہیں دلبر بنا دیا

ورنہ تاریخ شاہد ہے کہ اس دیس کے باشیوں کو کبھی خود مختاری و آزادی میسر ہی نہیں آئی تھی۔

آزادئ ہند

گو اس گفتگو کا موضوع ہندوستان کی آزادی اور غلامی نہیں تاہم دل چاہتا ہے کہ ایک طائرانہ نظر ڈالتے چلے جائیں ——— حضور بہادر شاہ کا دور ہے۔ انگریز تاجر حاکمانہ تیور اختیار کرچکے ہیں۔ ان کے پاس تربیت یافتہ افواج بھی ہیں اور اسلحہ بھی غداروں سے ساز باز ہوا ہے۔ ہندو ان کا سہارا لے کر مغلوں سے بے وفائی اور کج ادائی پر کمربستہ ہیں۔ مہابلی اکبر کی پوجا کرنے والے اس کی اولاد کی مخالفت پر در پردہ کمربستہ ——— رام موہن رائے حکومت انگلستان سے خط و کتابت فرما رہے ہیں۔ میں مرد نہیں میرا بھائی مرد ہے اپنی قوت سے آزادی حاصل کرنے کے اہل نہ تھے، انگریزوں کی بندوقوں کے پیچھے سنکھ بجانے کو تیار۔ سینہ بسینہ لڑنے کے اہل نہ تھے، پیٹھ میں خنجر بھونکنے پر کمربستہ ———

بہر صورت انگریزی افواج نے دلی کے باہر باڑے پر قبضہ
جمالیا۔ یہاں ان کی افواج پڑی ہیں۔ مسلمان جان نثاروں
نے ان پر رسد بند کر رکھی ہے، کسی جانب سے اشیاء خورد و نوش
نہیں پہنچنے دے رہے۔ ان حالات نے گوروں پر عرصۂ حیات
تنگ کر دیا ہے ——— انسان آن کا کیڑا ہے سب کچھ جھیل
جاتا ہے پر فاقہ کا تڑاقہ برداشت نہیں ہوتا۔ بالخصوص گورے
بھوک کے بڑے کچے ہوتے تھے۔ ایک وقت بھی پیٹ بھراؤ
نہ ملے تو یہ لمبے لمبے لیٹ جاتے تھے۔ ان کی کیفیت ہمارے
سپاہیوں کی سی نہیں جو پیٹ پر پتھر باندھ کر بھی لڑتے ہیں
بہر صورت کھانا نہ ملنے سے گورا فوج کی حالت خراب تھی اور
ان کے چھکے چھوٹے ہوئے تھے ——— اندرون شہر چھنّامل
والوں کا مہاجن خاندان تھا۔ یہ اندرون خانہ انگریزوں سے
ملے ہوئے تھے۔ جب انگریزوں تک کوئی اور صورت قوتِ
لایموت پہنچانے کی نظر نہ آئی تو ان غداروں بغلی گھونسوں نے
خمیری روٹیوں کی ارتھی بنائی اور جمنا کنارے مرگھٹ لے گئے
ادھر سے بالا ہی بالا باڑے پہنچا دی کسی کو پتہ بھی نہ چلا
——— لالہ جی ارتھی بنا کر غیر ملک والوں کو روٹیاں نہیں
پہنچا رہے تھے درحقیقت ہندوستان کے باشندوں کی آزادی
خود مختاری اور خودداری کی ارتھی ڈھو رہے تھے ———
اس گھرانے کو انگریزوں نے جو اس کا معاوضہ ادا کیا اس کے
شاہد پرانی دلی کے کوچہ و بازار ہیں۔ جب انگریزوں کا تسلط
ہو گیا تو مسلمانوں پر بغاوت کے الزام میں مقدمہ چلائے گئے
ان کی جائدادیں بحق سرکار بہادر ضبط ہوئیں اور نیلام، لاکھوں
کی املاک چھنّامل والوں کے نام کوڑیوں میں چھوڑ دی گئی۔ آج
پرانی دلی کا کونسا کوچہ و بازار ہے جہاں ان کی املاک نہ ہو
جو ہندو آج ہندوستان کی آزادی کا طرہ اپنی دوغنی پگڑی
میں لگانے کی کوشش کر رہے ہیں ذرا اپنے گریبان میں منہ ڈال کر
دیکھیں کہ جب وقت ہندوستان کی آزادی خود مختاری اور
خودداری لٹ رہی تھی اس وقت ہم کیا کر رہے تھے؟ اور یہ لکشمی
کے پجاری کیا کر رہے تھے؟ ہمارے اجداد اس کی بقا کے لئے
لڑ رہے تھے مر رہے تھے اپنے کو برباد کر رہے تھے اور یہ ارتھیاں
بنا بنا کر اغیار کو روٹیاں پہنچا رہے تھے ——— پھر ان
نمک خواروں نے ان کے ساتھ کیا کیا اس کی گواہی رام موہن
رائے کے وہ خطوط دیتے ہیں جو انھوں نے بعد میں برطانوی
حکومت کو تحریر کئے۔

جب انگریز بہادر کے اس دھرتی میں قدم جم گئے اور
پنجے گڑ گئے تو سوئی پر اپنا قبضہ جمایا اور جھوٹے باسن ان کے
آگے سرکا دیئے۔ رام موہن رائے اسی کا رونا روتا نظر آتا ہے
بار بار انگریزوں کو اور پارلیمنٹ کو ان کے وعدہ یاد دلاتا ہو
نیز لکھتا ہے کہ تم سے تو مغل بہتر تھے۔ ان کے زمانہ میں ہم کو
زیادہ مراعات حاصل تھیں علاوہ برایں ملک کی دولت ملک
میں رہتی تھی ——— یہ تھا نہلے پہ دہلا۔ بھارتی
بنئے کو ولایتی مہاجن نے پٹخنی دی۔ معاہدے یہ تھے کہ دونوں
مل کر حکومت کریں گے۔ برابر کے شریک ہوں گے مسلمانوں
کے سینہ پر مونگ دلیں گے۔ لالہ جی کی بھی پانچوں گھی میں ہوں گی
اور انگریز کے بھی مٹی چولیں سیدھے ہوں گے، صورت اس کے
برعکس ہوئی، لالہ مہاراج کو انگریز نے دودھ میں سے مکھی کی
طرح نکال کر پھینک دیا۔ اور پانچوں گھی میں تو کیسی؟ سر کڑھائی
میں نظر آیا ——— لالہ مہاراج کو صاحب بہادر نے فرمایا
بھوجی گھر بار تمہارا پر کوٹھری کھٹڑے کو ہاتھ نہ لگانا حکومت
سے تم کو واسطہ نہیں، ہاں ہمارے زیر سایہ تھوڑی بہت
اندرونی تجارت کرتے رہو اور مسلمانوں کی جیبیں کترتے رہو
جب پوری نہ ملی تو انھوں نے آدھی ہی کو غنیمت جانا۔
گھی گر چکا تھا روکھی سوکھی پر گذر کی۔ حکومت صاحب
بہادر کی بابو جی یہ بن گئے۔

مسلمان کی کیفیت اس وقت اس نواب زادہ کی سی
تھی جس کی جاگیر جائداد پر منیم جی نے قبضہ جما لیا ہو اور وہ
ہکا بکا رہ جائے ——— لا دتیں امیرانہ، اخراجات

ریاست لیکن گرہ میں چھدام نہیں۔ نہ ایک دم عادتیں بدل سکے، نہ اخراجات کم کرسکے، اپنی حیثیت کو بھی قائم رکھنا بڑوں کے وقار کا بھی سوال، حویلیوں کے خرچ، رسومات کے پچھلے سمدھیانے نباہے۔ دیوان خانوں کے خرچ، احباب کی تواضع۔ ملازمین۔ نمک خوار، تنخواہ داروں کی پلٹنیں، مطبخ کا خرچ، سواری شکاری کے اخراجات، عید بقرعید کے انعامات۔ غرض اخراجات تو سب قائم اور آمدنی بند اوپر کے طبقہ کا یہ عالم تھا ——— نیچے والے انہی کے ریزہ چیں تھے۔ جب ان کی تجوریاں خالی ہوگئیں تو غریب غربا کے چولھے بھی ٹھنڈے ہوگئے، غرض کہ تمام مسلمان اقتصادی بدحالی کا شکار ہوگئے اور ہر شخص نان شبینہ کی فکر میں مبتلا۔

ان حالات کے باوجود وہ اہل دین و ایمان بھی تھے جن کی طبائع پر اغیار کا تسلط گراں تھا اور سخت گراں وہ لڑے مرے جہاد کیا اور شہید ہوئے۔ آج لالہ جی خود کو ہندوستان کا آزادی دہندہ قرار دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو ——— عزیزان من اجب ہم مسلمانوں کے نو سال سے دس سال تک کے بچے آزادگی وطن کی خاطر خاک و خون میں نہا رہے تھے۔ اس وقت لالہ بھائی ہندوستان کی حکومت کے قبالا انگریزوں کے حوالہ فرما رہے تھے۔

بچھیرا پلٹن

میری عمر کے افراد نے بچھیرا پلٹن کی اصطلاح سنی ہے، دلّی میں جہاں بہت سے بچے ہوتے ان کو بھی عام طور پر بچھیرا پلٹن کہا جاتا تھا، بڑے بوڑھے جب گھر میں آتے اور پوتوں نواسوں کو نہ پاتے تو دریافت کیا کرتے تھے کہ بھئی آج بچھیرا پلٹن نظر نہیں آرہی، یا جب کنبہ کے سب بچے کسی تقریب میں کسی کے گھر آجاتے تو وہ کہتا تھا، یہاں آج ہمارے گھر پر بچھیرا پلٹن کا راج ہے ——— ہم آج مرے کل دوسرا دن، چاہتے ہیں کہ آپ کو بتا دیں کہ یہ بچھیرا پلٹن کیا تھی ——— دوستو! شہر کے امرا اور رؤسا کے بچے نو عمر شہزادوں اور سلاطین زادوں کے ساتھ کھیلنے قلعہ جایا کرتے تھے۔ دیگر کھیلوں کے ساتھ فوجی سوانگ بھی رچائے جاتے اور ان کی باقاعدہ باوردی پلٹن تھی۔ جہاد ۱۸۵۷ء کے موقع پر ان میں سے ایک ایک نونہال خاک و خون میں نہایا اس کے بعد سے یہ لفظ آپ کی زبان میں آیا اور اس نے ایک خاص مقام پایا۔

(باقی آئندہ)

سیبویہ کی بخشش

سیبویہ نحوی کو مرنے کے بعد کسی نے خواب میں دیکھا اور پوچھا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے ساتھ کیا معاملہ کیا؟ کہا "مجھے بخشدیا"۔ پوچھا! کس بات پر؟" کہا کہ ایک نحو کے مسئلہ پر، اور وہ مسئلہ یہ ہے کہ معرفہ کی بحث میں علماء نحو نے اختلاف کیا ہے کہ اعرف المعارف کیا چیز ہے؟ کسی نے کہا: "متکلم کی ضمیر" اور کسی نے کہا "مخاطب کی ضمیر"۔ میں نے لفظ "اللہ" کو اعرف المعارف کہا کہ اس سے بڑھ کر کوئی معرفہ نہیں، بس حق تعالیٰ کو یہ بات پسند آگئی، اور فرمایا کہ ——— "جاؤ تم کو بخشدیا"۔

قسط ۴

اسلامی مساوات

جناب حفیظ اللہ پھلواری

جبلہ بن ایہم غسانی شام کے سرحدی علاقے کا ایک عیسائی عرب تھا، اس نے عہد فاروقی میں اسلام قبول کیا مسلمان ہونے کے بعد کعبہ کا طواف کر رہا تھا کہ اتفاق سے اس کی چادر کا ایک کونہ کسی بدوی کے پیر کے نیچے آگیا۔ جبلہ نے غصہ میں آکر غریب بدوی کو ایک طمانچہ رسید کر دیا۔ بدوی نے بارگاہ خلافت میں فریاد کی۔ امیر المومنین نے جبلہ کو طلب فرما کر اس سے جواب طلب کیا۔ جبلہ نے کہا "اس نے میری چادر پر اپنا پیر رکھ دیا تھا، لہذا میں نے اسے طمانچہ مارا"۔ اقرار جرم پر امیر المومنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ تم سے قصاص لیا جائے گا" جبلہ نے دریافت کیا۔ "مجھ سے کیا قصاص لیا جائے گا؟ امیر المومنین نے ارشاد فرمایا۔ "وہ بدوی بھی تم کو طمانچہ لگائے گا" جبلہ نے کہا کہ "کیا ایک معمولی آدمی مجھے طمانچہ لگائے گا؟ میرے مرتبہ و امارت کا کوئی خیال نہیں رکھا جائے گا؟"

امیر المومنین نے فرمایا۔ "اسلام میں امارت اور غربت کا کوئی اعتبار نہیں۔ تم نے جیسا کیا ہے ویسا پاؤ گے"۔

امیر المومنین کی زبان سے یہ سن کر کہ اسلام میں شاہ و گدا برابر ہیں اور دونوں ایک ہی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ جبلہ نے ایک دن کی مہلت طلب کی جو اس کو دیدی گئی۔ جبلہ پوشیدہ طور پر مکہ سے نکل گیا اور اپنے یہاں جا کر مرتد ہوگیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کی کوئی پرواہ نہ کی۔

تو کیا امتیازات کے دلدادوں کا حشر بھی جبلہ کے ساتھ ہوگا؟ ہاں اس سے زیادہ سخت انتقام ایسے لوگوں سے لیا جائے گا، وہ تو علانیہ مرتد ہوگیا اور اس سے اسلام کو کوئی نقصان عظیم نہ برداشت کرنا پڑا اگر ان کا شمار تو منافقوں میں ہوگا۔ کیونکہ یہ اپنے کو اسلام کا پیرو کہہ کر اس میں گھن لگانا چاہتے ہیں۔

مدینہ کے قاضی حضرت زید بن ثابت کو عدالت میں ابی بن کعبؓ نے امیر المومنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ پر مقدمہ دائر کیا۔ قاضی کی عدالت سے امیر المومنین کو حاضر ہونے کا حکم جاری کیا گیا۔ جب حضرت عمر فاروقؓ عدالت میں حاضر ہوئے تو حضرت زیدؓ تعظیم کے لئے کھڑے ہو گئے، اور اپنی جگہ خالی کر دی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ناراضگی کا اظہار فرمائی۔ اور کہا — "زید! یہ تمہاری پہلی بے انصافی ہے"۔ اور اپنے فریق کے برابر بیٹھ گئے۔

مدعی ابی بن کعبؓ کے پاس کوئی ثبوت نہ تھا، حضرت عمرؓ کو دعویٰ سے انکار تھا، قاعدہ کے مطابق مدعی نے حضرت عمرؓ سے قسم نہیں چاہی۔ حضرت زیدؓ نے ان کے وقار کا لحاظ

رکھتے ہوئے ابی بن کعب کو دو کا، حضرت زیدؓ کی یہ طرفداری امیر المؤمنین کو پسند نہیں آئی اور آپ نے زید سے فرمایا :-

" جب تک تم عمر اور ایک عام آدمی کو ایک نظر سے نہ دیکھو گے اس وقت تک تم قاضی کے عہدہ کے قابل نہیں سمجھے جا سکتے "۔

حضرت عمرؓ نے "ولی" کی مرضی کے خلاف غیر کفو میں نکاح کا حکم دیا جس کی صورت یہ ہوئی کہ "حوالی" میں سے ایک مالدار شخص نے قریشی کی بہن کا پیغام بھیجا۔ قریشی نے یہ کہہ کر انکار کر دیا۔ "ان لنا حسبا و انہ لیس لھا بکفو" (ہم نسب والے ہیں وہ لڑکی کا کفو نہیں ہے)

جب اس کی اطلاع حضرت عمرؓ کو پہنچی تو آپ نے قریشی کو بلا کر کہا کہ وہ مالدار بھی ہے اور پرہیزگار بھی۔ اگر بہن راضی ہے تو نکاح کر دو۔ زوج الرجل ان کانت المرأۃ راضیۃ (اگر لڑکی راضی ہے تو اس سے نکاح کر دو)

چنانچہ بھائی نے جا کر پوچھا تو وہ راضی ہو گئی اور نکاح کر دیا گیا۔

فراجعھا اخوھا فرضیت فزوجھا فیہ (بھائی نے جب اس سے مراجعت کی تو وہ راضی ہو گئی اور اس کو نکاح کر دیا)

(ازالۃ الخفاء مقصد دوم سیاست فاروق اعظمؓ)

یہ کوئی معاشقہ کا معاملہ نہ تھا کہ حضرت عمرؓ نے مجبور ہو کر فیصلہ کیا ہو بلکہ حسب و نسب کے "بت" کو توڑنا مقصود تھا جس کے آہنی پنجے میں اب مسلم معاشرہ گرفتار ہو گیا ہے۔

(ماخوذ از مضمون مولانا محمد تقی صاحب امینی ناظم دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

حضرت امیر المؤمنین نے ایک دودھ فروش کی بیوہ لڑکی سے اپنے بیٹے "عاصم" کا نکاح کیا تھا جس کا واقعہ مشہور ہے

(ازالۃ الخفاء مقصد دوم حضرت عمرؓ)

حضرت امیر المؤمنین نے نہ لڑکی کا حسب و نسب دیکھا اور نہ معیار زندگی پر نظر کی، بس ان کو یہ ادا پسند آئی کہ جب لڑکی کی ماں نے دودھ میں پانی ملانے کو کہا تو اس نے جواب دیا کہ

" ظاہر و باطن ہر حال میں امیر المؤمنین کے حکم کی اطاعت کرنی چاہیے یہ نہیں ہو سکتا کہ دن کی روشنی میں تو اطاعت ہو اور رات کی تاریکی میں خیانت ہو"۔

ادھر شہزادہ نے نہ جہیز کی خواہش کی نہ بیوگی پر نظر کی اور نہ دل میں خیال آیا کہ اس کی شادی دودھ بیچنے والی لڑکی سے کیوں کر ہو۔

دراصل ان دونوں کی نظر زندگی کے اصل معیار پر تھی اور وہ "تقویٰ" ہے جس کا ثبوت لڑکی کے جواب میں مل چکا تھا بلکہ اسی کی بنیاد بنا کر شہزادہ نے بطیب خاطر آمادگی ظاہر کی تھی اور پیغام بھیجا گیا تھا۔ (ماخوذ از مضمون مولانا محمد تقی)

سیرۃ عمر بن عبدالعزیز میں ہے کہ :-

حضرت عمرؓ نے عاصم سے فرمایا ـــ "تم اسی لڑکی کو پیغام دو مجھے امید ہے کہ اس کے بطن سے ایسا جواں مرد پیدا ہوگا جو سارے عرب پر حکومت کرے گا۔ عاصم نے اسی سے نکاح کر لیا، عمر بن عبدالعزیز اسی کے نواسے ہیں"۔

امیر المؤمنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں ایک مرتبہ مجلس شوریٰ میں اختلاف آراء ہوا تو حضرتؓ امیر المؤمنین نے فرمایا۔

" میں بھی تم ہی میں سے ایک فرد ہوں۔ میرا منشا یہ نہیں کہ میں جو چاہوں اس کو تم بھی جان لو"

امیر المؤمنین حضرت فاروق رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے حضرت عبداللہ کو تقسیم اموال میں حضرت اسامہ بن زیدؓ سے کم درجہ پر رکھا گیا۔ اس پر حضرت عبداللہؓ نے عذر کیا کہ "واللہ اسامہؓ کسی موقع پر بھی مجھ سے آگے نہیں رہے"! اس مساوات کے فرشتہ نے جواب دیا۔

"ہاں۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسامہؓ کو تجھ سے زیادہ عزیز رکھتے تھے"۔

اللہ اللہ۔ مساوات کے بارے میں اسلام اور اس کے ماننے والوں کے معاملات عجیب و غریب تھے۔ آج تعجب ہے

کہ اسلام کے نام لینے والے طرح طرح کے خاندانی امتیازات و تفریقات کی پرستانہ پرستش کر رہے ہیں۔ آہ ایک زمانہ تھا کہ خداوند پاک اور اس کے حبیب کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے رشتہ اطاعت کے سوا دوسرا کوئی رشتہ نہیں تھا۔

غور کرو اور ان واقعات سے سبق لو۔ ایک غلام زادہ کو خلیفۂ وقت کے لڑکے پر فوقیت دی جاتی ہے اور وہ چوں نہیں کرتا۔

ایک بار قریش کے چند سردار جن میں ابو سفیانؓ بھی تھے، امیر المؤمنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی ملاقات کے لئے آئے تھے۔ حضرت صہیب رومیؓ اور حضرت بلالؓ بھی اسی غرض سے وہاں تشریف لے گئے تھے، حضرت امیر المؤمنین نے سب سے پہلے حضرت بلالؓ وغیرہ کو بلایا اور دوسرے سرداران قریش بیٹھے رہے ابو سفیانؓ کو یہ بات ناگوار معلوم ہوئی، انھوں نے دوسرے سرداروں سے کہا کہ ــ "دیکھو! ہم لوگ یہاں بیٹھے رہ گئے اور غلاموں کو اندر جانے کی اجازت ملگئی" ان میں ایک حق شناس تھا۔ اس نے کہا ــ "یہ اپنا قصور ہے۔ بلالؓ وغیرہ کو اس کا فخر حاصل ہے کہ انھوں نے ہم لوگوں سے پہلے اسلام قبول کیا"۔

حضرت امیر المؤمنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنی وفات کے وقت جب منصب خلافت کا مسئلہ مجلس شوریٰ میں پیش کیا تو فرمایا

"اگر سالم مولیٰ ابی حذیفہ موجود ہوتے تو میں انھیں خلافت کے لئے نامزد کرتا"

تم جانتے ہو حضرت سالمؓ کون تھے جن کے متعلق حضرت عمرؓ کے خیالات ایسے اچھے تھے کہ دنیا کے تمام مسلمانوں کا سردار بنانے کے لئے نامزد فرمادینے کو مستعد تھے؟ ان کا شمار اکابر صحابہ میں ہے۔ تم نے خیال کیا ہوگا کہ وہ خاندان قریش کے کسی معزز گھرانے سے ہوں گے۔ نہیں۔ وہ حضرت ثبیتہؓ کے جو قریشی سردار ابو حذیفہؓ کی بیوی تھیں، غلام تھے۔ شروع اسلام میں آقا اور غلام اسلام کے حلقہ میں شامل ہوئے تھے اسلام قبول کرنے کے بعد حضرت ثبیتہؓ نے حضرت سالمؓ کو آزاد کردیا اور حضرت ابو حذیفہؓ نے اپنی بھتیجی فاطمہؓ بنت ولید سے شادی کردی۔ حضرت سالم مسجد قبا کے امام مقرر ہوئے تھے جن کے پیچھے حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما جیسے جلیل القدر حضرات اکثر نماز پڑھا کرتے تھے۔

گورنر کے نام

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے ایک گورنر کے نام خط میں تحریر فرمایا:

"امیر المؤمنین کو یہ خبر ملی ہے کہ تم اور تمہارے گھر والوں نے ایسا کھانا، ایسا لباس اور ایسی سواری اختیار کی ہوئی ہو جو عام مسلمانوں کو میسر نہیں۔

خدا کے بندے! اس جانور کی طرح نہ بنو جو کسی سرسبز وادی میں پہنچکر یہ سمجھتا ہے کہ اس کی زندگی کا مقصد موٹا تازہ ہونے کے سوا کچھ نہیں، ـــ اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہو کہ اس کی موت مٹاپے ہی سے واقع ہوتی ہے۔

یاد رکھو کہ حاکم کو بھی اللہ کی طرف لوٹنا ہے، اگر حاکم ٹیڑھی راہ اختیار کرے تو ساری رعیت ٹیڑھی ہوجاتی ہے۔ اور بدترین شخص وہ ہے جس کی وجہ سے اس کی رعیت بدبخت ہوجائے ـــ والسلام

مولانا محمد عاشق الٰہی بلند شہری

خواتین اسلام سے

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں

(ماہ بھنوں بیٹیوں!)

پندرھویں حدیث

وعن عبد الرحمٰن بن عابسٍ قَالَ سَمِعْتُ ابْنَ عَبَّاسٍ قِيْلَ لَهُ أَشَهِدْتَ الْعِيْدَ مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ نَعَمْ فَصَلّٰى ثُمَّ خَطَبَ ثُمَّ أَتَى النِّسَاءَ وَمَعَهُ بِلَالٌ فَوَعَظَهُنَّ وَذَكَّرَهُنَّ بِالصَّدَقَةِ فَرَأَيْتُهُنَّ يَهْوِيْنَ بِأَيْدِيْهِنَّ يَقْذِفْنَهُ فِيْ ثَوْبِ بِلَالٍ ثُمَّ انْطَلَقَ هُوَ وَبِلَالٌ إِلٰى بَيْتِهِ وَفِيْ رِوَايَةٍ فَبَسَطَ بِلَالٌ ثَوْبَهُ فَيُلْقِيْنَ الْفَتَخَ وَالْخَوَاتِيْمَ فِيْ ثَوْبِ بِلَالٍ (رواه البخاری ۱۳۳)

ترجمہ: حضرت عبدالرحمٰن بن عابس کا بیان ہے کہ حضرت ابن عباس رضؓ سے کسی نے پوچھا کیا آپ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عید کے موقعہ پر حاضر رہے ہیں انھوں نے جواب دیا کہ ہاں میں آپ کے ساتھ عید میں موجود تھا۔ آپ نے عید کی نماز ادا فرمائی اس کے بعد خطبہ دیا پھر عورتوں کے پاس تشریف لائے اور انکو نصیحت فرمائی اور (آخرت کی باتیں) یاد دلائیں اور صدقہ کا حکم فرمایا اس موقعہ پر آپ کے ساتھ حضرت بلال رضؓ بھی آئے تھے، انھوں نے اپنا کپڑا پھیلا دیا اور عورتیں ان کے کپڑے میں اپنے زیور اتار اتار کر پھینکتی رہیں ان زیوروں میں موٹی موٹی انگوٹھیاں (بھی) تھیں اس کے بعد آپ حضرت بلال رضؓ کو ہمراہ لیکر اپنے دولتکدہ کی طرف روانہ ہو گئے (بخاری شریف صفحہ ۱۳۳)

تشریح: حضرت ابن عباس رضؓ کی دوسری روایت میں یہ الفاظ ہیں فَرَأَيْتُهُنَّ يَهْوِيْنَ إِلٰى آذَانِهِنَّ وَحُلُوْقِهِنَّ يَدْفَعْنَ إِلٰى بِلَالٍ۔ یعنی میں نے دیکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ترغیب پر عورتوں نے صدقہ دینا شروع کیا اور اپنے کانوں اور حلقوں کے زیور اتار اتار کر دیتی رہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ بڑی بڑی انگوٹھیوں کے ساتھ کانوں کی بالیاں، جھمکیاں اور گلوں کے ہار بھی ان آخرت سے محبت رکھنے والی مستورات نے بارگاہ رسالت میں پیش کر دیئے، آپ کا یہ صدقہ وصول کرنا عام ضرورتمندوں پر خرچ کرنے کے لئے تھا، آپ کے لئے صدقے کا مال حلال نہیں تھا، وہاں سے اٹھ کر اپنی صوابدید سے فقراء اور مساکین پر خرچ فرما دیا، اس قصے سے صحابی عورتوں کی سخاوت کا پتہ چلا اور یہ معلوم ہوا کہ آخرت کی محبت اور مرنے کے بعد ملنے والے ثواب کے مقابلے میں ان کے نزدیک زیور کی کوئی حقیقت نہ تھی جو کہ عقین کا مال تھا اس لئے جنت کے زیور کی طلب اور رغبت کے پیش نظر انھوں نے

ہے جبکہ اپنے زیور فی سبیل اللہ اتار کر دیدیئے اور اس فانی دنیا میں کانوں گلوں اور ہاتھوں کو بغیر زیور کے رکھنا پسند کر لیا اللہ تعالیٰ ہم کو بھی ایسے ہی جذبات نصیب فرمائے آمین۔

مسئلہ یہ دیکھنا چاہئے کہ زیور کا مالک شوہر ہے یا بیوی جو مالک ہو اس پر زکوٰۃ کی ادائیگی فرض ہے، بعض لوگ کہدیتے ہیں کہ ہم نے تو بیوی کو دیدیا وہی زکوٰۃ کی ذمہ دار ہے حالانکہ اگر لڑائی ہو جائے یا طلاق کا موقعہ آجائے تو زیور واپس لینے لگتے ہیں اس سے معلوم ہوا کہ اصل مالک مرد ہے ورنہ واپس کیوں لیتا، ہاں اگر وہ زیور عورت نے .... اپنی مہر کی رقم سے بنوایا ہے یا کسی کے ترکہ میں ملا ہو یا شوہر نے بنوا کر بالکل اسے دیدیا ہے اس کی زکوٰۃ عورت ادا کرے۔ مسئلہ جو زیور شوہر کی ملکیت ہو اس کو شوہر کی اجازت کے بغیر صدقہ کرنا جائز نہیں ہے۔ مسئلہ: نابالغ بچی کے لئے جو زیور بنایا گیا ہو اگر بچی ہی کی ملکیت قرار دیدی ہے تو اس پر زکوٰۃ نہیں اور اگر وہ صرف پہنتی ہے اور مالک ماں یا باپ یا کوئی دوسرا وصی ہے تو اس پر زکوٰۃ فرض ہے۔ اس فرق کو خوب سمجھ لینا چاہئے۔

سولھویں حدیث ۱۶

عَنْ اَبِیْ اُمَامَۃَ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اُرِیْتُ اَنِّیْ دَخَلْتُ الْجَنَّۃَ فَاِذَا اَعَالِیْ اَھْلِ الْجَنَّۃِ فُقَرَاءُ الْمُھَاجِرِیْنَ وَذَرَارِی الْمُؤْمِنِیْنَ وَاِذَا لَیْسَ فِیْھَا اَحَدٌ اَقَلَّ مِنَ الْاَغْنِیَاءِ وَالنِّسَاءِ فَقِیْلَ لِیْ اَمَّا الْاَغْنِیَاءُ فَاِنَّھُمْ عَلَی الْبَابِ یُحَاسَبُوْنَ وَاَمَّا النِّسَاءُ فَاَلْھَاھُنَّ الْاَحْمَرَانِ الذَّھَبُ وَالْحَرِیْرُ (رواہ ابن حبان کما فی الترغیب ج ۳ ص ۱۰۱)

ترجمہ: حضرت ابو امامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مجھے اللہ کی طرف سے .... یہ منظر دکھایا گیا کہ میں جنت میں داخل ہوا ہوں، وہاں کیا دیکھتا ہوں کہ بلند درجوں والے وہ بے پیسہ والے حضرات ہیں جنھوں نے (اللہ کی رضا کے لئے) وطن چھوڑ کر ہجرت کی ہے اور اہل ایمان کے بچے بھی اعلیٰ درجات میں ہیں اور جنت میں مالدار اور عورتیں سب سے کم ہیں (یہ دیکھ کر میرے دل میں اس کا سبب معلوم ہونے کا داعیہ پیدا ہوا) چنانچہ مجھے بتایا گیا (کہ دروازہ پر مالداروں کا حساب ہو رہا ہے اس لئے نہیں پہونچے اور عورتیں یہاں آنے سے اس لئے رہ گئیں کہ ان کو سونے اور ریشم نے (اللہ تعالیٰ سے اور دین و آخرت سے) غافل کر دیا تھا (ترغیب وترہیب ج ۳ ص ۱۰۱ طبع مصر)

تشریح: ایک حدیث میں ہے جس کے راوی حضرت اسامہ بن زیدؓ ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں جنت کے دروازہ پر کھڑا ہوا تو دیکھا تو اس میں اکثر داخل ہونے والے مسکین لوگ ہیں (جن کے پاس دنیا میں مال و دولت نہ تھا جس کے ذریعہ اللہ کو بھول کر گناہوں میں مبتلا ہوتے) اور مال والے تو ابھی حساب دینے کے لئے روک لئے گئے ہیں، البتہ جن مالداروں کو داخل دوزخ ہونا ہے ان کے بارے میں دوزخ میں جانے کا حکم مل چکا ہے اور میں دوزخ کے دروازے پر کھڑا ہوا تو دیکھا کہ اس کے اندر داخل ہونے والوں میں اکثر عورتیں ہیں (مشکوٰۃ شریف ص ۴۴۶)

اس حدیث سے اور اس کے علاوہ اور بھی بعض حدیثوں سے واضح طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ دوزخ میں اکثر عورتیں ہوں گی، اور اس کے اسباب بھی کئی عدد بتائے گئے ہیں جو احادیث ہی میں مذکور ہیں انشاء اللہ تعالیٰ البلاغ کی آئندہ کسی اشاعت میں شائع ہوں گے، لیکن حدیث ۱۶ میں جو سبب بتایا ہے اسکی کچھ تشریح یہاں کی جاتی ہے۔

اس حدیث میں بتایا ہے کہ عورتوں کے دوزخ میں داخل ہونے کا سبب یہ ہے کہ دنیا میں ان کو ریشم اور سونے نے یادِ خدا سے اور احکام شریعت پر عمل پیرا ہونے سے غافل رکھا درحقیقت عورتوں میں اچھے سے اچھے کپڑے اور عمدہ سے عمدہ زیور کی طلب اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ ان دونوں چیزوں کے لئے بہت سے گناہوں میں نہ صرف خود مبتلا ہوتی ہیں بلکہ اپنے شوہروں اور دوسرے عزیزوں کو بھی مبتلا ....

کرتی ہیں کہ پھر زیور حاصل کرنے کے لئے نہ حلال دیکھتی ہیں نہ حرام، اس مقصد کے لئے مردوں کو رشوت لینے یا سود دینے پر مجبور کرتی ہیں، اور کسی طرح بن نہ پڑے تو قرض کے ذریعہ رقم حاصل کر کے زیور بنواتی ہیں، پھر یہ قرض اکثر ادا بھی نہیں ہوتا، اور فرض کرو اگر حلال ہی سے زیور بنوا لیا تو دوسری خرابی یہ ہے کہ دکھاوے کے لئے پہنتی ہیں جس کے پاس زیور نہ ہو اسے حقیر جانتی ہیں اور زکوٰۃ نہ دینے کا وبال الگ ہوتا ہے یہ سب بڑے بڑے گناہ ہیں جو جنت سے محروم کر کے دوزخ کے داخلہ کا سبب بنتے ہیں۔[۱]

زیور اصلی ضرورت کی چیز نہیں ہے محض زینت کی چیز ہے جو ہر وقت استعمال بھی نہیں ہوتی، زینت محض کو رشوت لیکر یا سود دے کر یا قرض کی رقم کے ذریعہ حاصل کرنا اور پھر اس کی وجہ سے دوزخ میں چلا جانا بہت بڑی نادانی ہے اگر زیور بناؤ تو صرف حلال سے بناؤ اور بقدر نصاب ہو تو زکوٰۃ کی ادائیگی کی فکر کرو، اور زیور دکھاوے کے لئے نہ پہنو نہ کسی بے زیور والی کو حقیر جانو اللہ تعالیٰ ہم سب کو عمل کی توفیق نصیب فرمائے۔ آمین یارب العالمین)

---

[۱] زیور کی خرید و فروخت میں بھی بہت سے گناہ ہو جاتے ہیں یعنی شریعت کے مطابق خریداری کا اہتمام نہیں کیا جاتا ہے اس کی تفصیل بہشتی زیور حصہ پنجم میں دیکھ لیجائے اور ایک گناہ بے پردگی ہوتا ہے۔ کیونکہ سنار کے سامنے منہ کھول کر بے تکلف بیٹھتی ہیں جیسے بھائی یا شوہر ——— ہی ہے۔ العیاذ باللہ

مولانا محمد عاشق الٰہی بلند شہری

ڈاڑھی کی مقدار کی تحقیق

ڈاڑھی کس قدر رکھنی ضروری ہے۔ کیا نہ رکھنا گناہ ہے۔ کیا خط بنانا وغیرہ ضروری ہیں؟

مشتاق محمود خاں۔ ہیڈ ڈرافٹمین۔ قلات

ڈاڑھی کے بارے میں شرعی حکم یہ ہے کہ اسے طول و عرض میں ایک مٹھی کی مقدار تک بڑھنے دیا جائے مٹھی بھر ہونے سے پہلے ڈاڑھی کو کاٹنا گناہ، اور اسلامی شعار کی خلاف ورزی ہے، ـــــ البتہ مشت بھر چھوڑ کر باقی کو کاٹنا سنت ہے۔

اس مسئلہ میں چونکہ بعض غلط فہمیاں اس زمانہ میں پیدا کر دی گئی ہیں، اس لئے کسی قدر توضیح ضروری ہے۔ اور وہ یہ کہ اس بات پر تمام فقہائے اسلام کا اتفاق ہے کہ ڈاڑھی بڑھانا واجب ہے، امت میں کسی فقیہ یا مجتہد نے ڈاڑھی ایک مشت سے کم کرنے کو جائز قرار نہیں دیا، ـــــ البتہ ایک مشت سے بڑھے ہوئے بالوں کے بارے میں فقہائے اسلام کے تین قول ہیں، ایک یہ کہ بڑھے ہوئے بال کاٹنا بھی جائز نہیں، دوسرا یہ کہ بڑھے ہوئے بال کاٹنا واجب ہے، اور تیسرا یہ کہ کاٹنا سنت ہے، حنفیہ[1] اور شافعیہ وغیرہ نے اسی کو اختیار کیا ہے۔ مذکورہ مسئلہ میں احادیث کے دلائل درج ذیل ہیں۔

(۱) بخاری اور مسلم[2] کی متفقہ روایت ہے

عن ابن عمر رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم "خالفوا المشرکین اوفروا اللحی واحفوا الشوارب (مشکوٰۃ صفحہ ۳۸ اصح المطابع کراچی)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "مشرکین کی مخالفت کرو داڑھیاں بڑھاؤ اور مونچھیں خوب کاٹو۔

مسلم کی روایت ہے۔

عن عائشۃ رض قالت قال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم عشرٌ من الفطرۃ قص الشارب واعفاء اللحیۃ الحدیث

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ دس چیزیں فطرۃ میں سے ہیں، مونچھیں کاٹنا اور داڑھی بڑھانا۔ الخ

---

[1] درمختار۔ ص ۳۵۹ ج ۲ [2] علامہ عینی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث صحاح ستہ میں سے بخاری کے علاوہ ہر کتاب میں موجود ہے، اور طحاوی نے اسے صحیح کہا ہے (عینی شرح بخاری ص ۱۴۳ ج ۱۰)

پہلی حدیث سے دو باتیں معلوم ہوئیں (۱) ایک یہ کہ داڑھی (صرف رکھنا ہی نہیں) بلکہ بڑھانا واجب ہے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا صریح حکم دیا ہے (۲) دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ داڑھی بڑھانے کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کا قومی شعار اور علامت قرار دیا ہے جو ان کی ہیئت کو مشرکین کی ہیئت سے ممتاز کرتا ہے

دوسری حدیث سے یہ بات معلوم ہوئی کہ داڑھی بڑھانا صرف اسی امت پر واجب نہیں کیا گیا بلکہ پچھلے تمام انبیاء اس پر عمل کرتے رہے ہیں اور ان کی امتوں کو بھی اس کا حکم دیا گیا تھا، کیونکہ اس حدیث میں داڑھی بڑھانے کو فطرت میں شمار کیا گیا ہے، اور ہر وہ شخص جو قرآن و سنت پر نظر رکھتا ہے جانتا ہے کہ قرآن و سنت کی اصطلاح میں فطرت ان امور کو کہا جاتا ہے جن پر تمام انبیاء کرام علیہم السلام نے متفقہ طور پر عمل کیا ہو اور ان کی امتوں میں وہ مشروع رہی ہوں

مذکورہ دونوں حدیثوں کا مضمون دیگر بہت سی احادیث میں بھی آیا ہے جن کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں، البتہ ان دونوں حدیثوں میں بڑھانے کی کوئی حد مقرر نہیں کی گئی۔ اگر دوسری احادیث جو آگے آرہی ہیں اس بارے میں موجود نہ ہوتیں تو مذکورہ دونوں حدیثوں کا تقاضا تھا کہ ایک مشت سے بھی آگے بڑھانا واجب ہوتا، اور کسی حد پر بھی ڈاڑھی کو کاٹنا جائز نہ ہوتا ــــ مگر ترمذی کی روایت ہے کہ

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان یاخذ من لحیتہ من عرضہا و طولہا۔

کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی داڑھی کے طول و عرض میں سے کچھ لیا (کاٹا) کرتے تھے۔

(مشکوٰۃ ص۳۸ اصح المطابع کراچی)

اس حدیث سے کاٹنے کی صحیح مقدار تو معلوم نہیں ہوئی (وہ اگلی روایت سے معلوم ہوگی) لیکن اتنا اس روایت سے بھی معلوم ہوگیا کہ یہ کاٹنا اتنا کم تھا کہ اسے "کاٹنے" سے تعبیر نہیں کیا گیا بلکہ "یاخذ" (لیا کرتے تھے) سے تعبیر کیا گیا ہے ــــ پھر یہ بات بھی سمجھ میں آنے والی ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے داڑھی کو "بڑھانا" واجب کیا اور مسلمانوں کی قومی علامت قرار دیا ہے تو خود اپنی داڑھی آپ اتنی ہرگز نہ کاٹتے ہوں گے جو "بڑھانے" کے منافی ہو۔ چنانچہ دوسری روایات میں اس کی صراحت موجود ہے۔ اور تنویر برشرح شرعۃ الاسلام میں اس حدیث کے الفاظ ہی میں یہ صراحت بھی موجود ہے کہ

کان یاخذ من لحیتہ طولاً وعرضاً اذا زاد علی قدر القبضۃ۔ وکان یفعل ذالک فی الخمیس او الجمعۃ ولا یترکہ مدۃ طویلۃ۔

آپ اپنی داڑھی کے طول و عرض میں سے لیا (کاٹا) کرتے تھے جبکہ بال مٹھی بھر سے زائد ہو جاتے تھے اور یہ آپ جمعرات یا جمعہ کو کیا کرتے تھے اور بالوں کو طویل مدت تک نہ چھوڑتے تھے۔

بخاری کی روایت ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما بھی (جو آپ کی سنتوں کے شیدائی مشہور ہیں) حج اور عمرہ کے وقت اپنی داڑھی کے ایک مٹھی سے زائد حصہ کو کترتے تھے۔

اور فتح الباری میں طبری کے حوالے سے روایت ہے کہ حضرت ابن عمرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم بھی جب داڑھی یکمشت سے زائد ہو جاتی تو کتر دیا کرتے تھے، ان سب روایات سے یکمشت سے زائد حصے کو کترنے کا سنت ہونا معلوم ہوا۔

خلاصہ یہ کہ احادیث میں داڑھی بڑھانے کی تاکید آئی ہے۔ تمام فقہائے اسلام اس کے واجب ہونے پر متفق ہیں۔ پچھلے تمام انبیاء اور ان کی امتوں میں داڑھی بڑھانا مشروع تھا البتہ صرف ایک مشت سے زائد حصے کو کاٹنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام سے ثابت ہے۔ اس سے زائد کاٹنا کسی دلیل شرعی سے ثابت نہیں، لہٰذا داڑھی کو ایک مشت ہونے سے پہلے کاٹنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی نافرمانی اور اسلامی شعار کی خلاف ورزی ہے۔

اس مسئلہ کے اور بھی دلائل قرآن وسنت میں موجود ہیں یہاں خلاصہ ذکر کیا گیا ہے، واللہ اعلم۔

(مولانا محمد رفیع عثمانی)

نماز میں صف بندی کا طریقہ

نماز میں صف بندی کا کیا طریقہ ہے۔ اگر شروع میں دس آدمی ہوں پھر بعد میں سو دو سو چار ہو گئے تو کس طرح کھڑے ہوں؟

(محمد شریف ملک۔ سیالکوٹ)

صف بندی کا طریقہ یہ ہے کہ امام کے پیچھے سے صف بنانا شروع کریں اور دائیں بائیں دونوں طرف برابری کا خیال کرتے ہوئے خوب مل مل کر کھڑے ہوتے چلے جائیں، درمیان میں جگہ نہ چھوڑیں۔ حدیث شریف میں توسطوا الامام (امام کو درمیان میں کرو) اور اصوا صفوفکم (صفوں میں خوب اچھی طرح مل مل کر کھڑے ہوا کرو) کا حکم وارد ہوا ہے۔ ہر آنے والا یہ دیکھتا جائے کہ امام کے کس طرف آدمی کم ہیں، جس جانب آدمی کم ہوں اس طرف کھڑا ہو جائے۔ جب پہلی صف اس طرح بھر جائے تو دوسری صف اسی طریق اور ترتیب سے شروع کر دیں پھر تیسری صف والے بھی ایسا ہی کریں، ایسا کرنے سے سب صفیں درست ہوتی چلی جائیں گی۔ آج کل صف بندی کے لئے اتباع سنت سے زیادہ آرام کو دیکھا جاتا ہے۔ مثلاً پنکھے کے نیچے کھڑے ہونے کو ترجیح دی جاتی ہے۔ اگر پنکھے کے نیچے جگہ ہو تو وہیں کھڑے ہونے کو مناسب جانتے ہیں، خواہ اس کی وجہ سے صف اول ادھوری رہ جائے خواہ کسی ایک جانب مقتدی زیادہ ہو جائیں، آرام طلبی کے جذبات کو صفیں بگاڑنے میں بڑا دخل ہے۔

(مولانا محمد عاشق الٰہی)
بلند شہری

پردہ شرعی کی اہمیت

دیہات میں پردہ کرنے کی کیا صورت ہے جبکہ عورتوں کو کام کاج کے لئے باہر نکلنا ضروری ہو؟ اور ہر شخص نوکر چاکر نہیں رکھ سکتا۔

(محمد شریف ملک۔ سیالکوٹ)

پردہ کرنے کے لئے برقع اوڑھنا ہی ضروری نہیں ہے جس سے کام کاج میں تکلیف ہو۔ خوب بڑی چادر جو سر سے پاؤں تک ڈھانکے ہوئے ہو، اور سر، چہرہ، گلا، سینہ پوری طرح ڈھانکا ہوا ہو تو پردہ شرعی ہو جاتا ہے اور اس پردہ کے اہتمام سے پانی وغیرہ لانے یا جانوروں کی ضروریات کے لئے باہر نکلنے میں کوئی دشواری نہ ہوگی اگر دشواری ہو بھی تو برداشت کریں۔ آخر حکم شریعت ہے، پھر چونکہ حکم شرعی ہے اس لئے مرد و عورت سب ہی مل کر اس کو انجام دیں، عورتیں درمیان راستہ میں نہ چلیں، مردوں سے بچیں اور مرد راستوں میں کھڑے نہ ہوں اور عورتوں کی طرف نظر اور قلب متوجہ نہ کریں، یہ سب احکام حدیث شریف میں آئے ہوئے ہیں، اگر کسی عورت سے پردہ میں کوتاہی ہو جائے تو مرد کو اس پر نظر ڈالنا جائز نہیں ہو جاتا ہے۔ مشکلات اس وجہ سے نہیں ہیں کہ حکم شرع مشکل ہے بلکہ دشواری کا باعث یہ ہے کہ چند اشخاص کرنا چاہتے ہیں باقی بے عمل بلکہ بدعمل ہونے کو ترجیح دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سب کو ہدایت دے۔

(مولانا محمد عاشق الٰہی)
بلند شہری

محمد تقی عثمانی

تراشے

فراستِ مؤمن

جب حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے قیساریہ کو فتح کر کے غزہ کا محاصرہ کیا تو وہاں کے گورنر نے ان کے پاس پیغام بھیجا کہ آپ گفتگو کے لئے کوئی آدمی میرے پاس بھیجیے؛ حضرت عمروؓ ایک عام آدمی کی حیثیت سے خود تشریف لے گئے، اور گفتگو شروع کی۔ غزہ کا گورنر ان کے حکیمانہ اندازِ گفتگو اور جرأت و بے باکی سے بڑا متاثر ہوا اس نے پوچھا:

"کیا تمہارے ساتھیوں میں تم جیسے کچھ اور لوگ بھی ہیں؟"

حضرت عمروؓ نے فرمایا: "یہ بات نہ پوچھیے، میں تو ان میں سب سے کمتر آدمی ہوں، جبھی تو انھوں نے مجھے یہاں بھیجنے کا خطرہ مول لیا ہے"

غزہ نے یہ سن کر انھیں کچھ تحفے دینے کا حکم دیا، اور ساتھ ہی دربان کے پاس حکم لکھ کر بھیجدیا کہ: "جب یہ شخص تمہارے پاس سے گذرے تو اسے قتل کر کے اس کا مال چھین لو"

حضرت عمرؓ جب واپس جانے کے لئے مڑے تو راستے میں غسان کا ایک عیسائی ملا اس نے حضرت عمروؓ کو پہچان لیا اور چپکے سے بولا:

"عمرو تم اس محل میں اچھی طرح داخل ہوئے تھے، اچھی طرح ہی نکلنا"

یہ سن کر حضرت عمروؓ ٹھٹھک گئے، وہ فوراً مڑے اور واپس گورنر کے پاس پہنچ گئے، سردار نے پوچھا:

"کیا بات ہے، واپس کیوں آ گئے"؟

حضرت عمروؓ نے جواب دیا: آپ نے مجھے جو تحفے دیئے ہیں، میں نے انھیں دیکھا تو اندازہ ہوا کہ یہ میرے چچازاد بھائیوں کے لئے کافی نہیں ہیں، لہٰذا میرے دل میں یہ آ رہا ہے کہ میں اپنے دس بھائیوں کو آپ کے پاس لے آؤں، آپ یہ تحفے ان سب میں تقسیم کر دیں، اس طرح آپ کا تحفہ ایک کے بجائے دس آدمیوں کے پاس پہنچ جائے گا"

گورنر دل ہی دل میں خوش ہوا کہ اس طرح ایک کے بجائے دس آدمیوں کو قتل کرنے کا موقع ملے گا، چنانچہ اس نے کہا "تم ٹھیک کہتے ہو، انھیں جلدی سے لے آؤ"

اور یہ کہکر دربان سے کہلا دیا کہ "اب اس شخص کو جانے دو" حضرت عمروؓ محل سے نکل کر دور تک مڑ مڑ کر دیکھتے رہے اور جب خطرے کی حدود سے باہر نکل گئے تو فرمایا۔

"آئندہ ان جیسے غداروں کے پاس نہیں آؤں گا"

چند روز کے بعد غزہ کے گورنر کو صلح کی درخواست کرنی پڑی۔ اس مقصد کے لئے وہ خود مسلمانوں کے پاس آیا اور جب حضرت عمروؓ کے خیمے میں داخل ہو کر انھیں امیر لشکر

کی حیثیت سے بیٹھا دیکھا تو اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی اس نے بوکھلا کر پوچھا۔

"کیا آپ وہی ہیں؟"

"جی ہاں" حضرت عمرؓ نے جواب دیا۔ "میں تمہاری غداری کے باوجود زندہ ہوں"۔

(الوصایا الخالدۃ مطابع العربیۃ بقطر ص ۲۵۷)

"نصیحت"

ابو جعفر منصور سلطنت عباسیہ کا مشہور خلیفہ ہے، ایک دن اس نے اپنے زمانے کے مشہور عالم اور فقیہ حضرت عبدالرحمن بن قاسمؒ سے درخواست کی کہ: "مجھے کچھ نصیحت فرمایئے"

حضرت عبدالرحمنؒ نے فرمایا: "ایک واقعہ کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں، حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے گیارہ بیٹے چھوڑ کر وفات پائی، لیکن ان کے ترکہ میں کل سترہ دینار تھے جن میں سے پانچ دینار کفن پر خرچ ہو گئے، اور دو دینار میں قبر کے لئے جگہ خریدی گئی، اور اس طرح ہر بیٹے کے حصے میں کل انیس درہم آئے۔

(الیواقیت العصریۃ ص ۱۰۹ و ۱۱۰)

حضرت عمرؓ کا خطبہ اپنی سختی کے بارے میں

حضرت عمرؓ کو خلافت سنبھالنے کے بعد یہ اطلاع ملی کہ لوگ ان کی سختی سے خوف زدہ ہیں تو انھوں نے لوگوں کو جمع کر کے ایک تقریر کی جس میں حمد و ثنا کے بعد فرمایا "مجھے یہ اطلاع ملی ہے کہ لوگ میری سختی سے خوف زدہ ہیں؛ اور میری درشتی طبع سے ڈرتے ہیں، ان کا کہنا یہ ہے کہ عمر اس وقت بھی ہم پر سختی کرتا تھا جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے درمیان موجود تھے، اور اس وقت بھی سختی کرتا تھا، جب ابو بکر رضی اللہ عنہ ہمارے خلیفہ تھے، اب تو تمام اختیارات اس کے پاس چلے گئے ہیں، اب نہ جانے اس کی سختی کا کیا حال ہوگا۔

تو سُن لیجئے کہ جس شخص نے بھی بات کہی ہے اس نے سچ کہا ہے، میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھا تو آپ کا غلام اور خادم رہا یہاں تک کہ آپ بحمد للہ مجھ سے راضی ہو کر دنیا سے تشریف لے گئے۔ اور اس معاملے میں میں تمام لوگوں سے زیادہ خوش قسمت ہوں، پھر ابو بکر رضی اللہ نے خلافت سنبھالی تھیں ان کا خادم اور مددگار رہا، میں اپنی سختی کو ان کی نرمی کے ساتھ ملائے رکھتا تھا۔ اور اس وقت تک ننگی تلوار بنا رہتا تھا جبتک وہ مجھے نیام میں نہ کر دیں، یہاں تک کہ اللہ نے انھیں بھی اس حال میں اٹھایا کہ بحمد للہ وہ مجھ سے راضی تھے، اور میں اس معاملے میں تمام لوگوں سے زیادہ خوش قسمت ہوں۔

اب مجھے تمھارے معاملات سونپے گئے ہیں، یاد رکھو کہ، اب اس سختی میں کئی گنا اضافہ ہو گیا ہے، لیکن یہ صرف ان لوگوں کے لئے ہے جو مسلمانوں پر ظلم اور زیادتی کو روا رکھیں، رہے وہ لوگ جو دیندار راست رو اور سلیم الفکر ہیں، میں ان پر خود ان سے زیادہ نرم ہوں، ہاں البتہ جو شخص کسی پر ظلم کرنا چاہے میں اسے اس وقت تک نہیں چھوڑوں گا جبتک اس کا ایک رخسار زمین سے ملا کر اس کے دوسرے رخسار پر پاؤں نہ رکھدوں اور وہ حق کا اعلان نہ کر دے۔

لوگو! تمھارا مجھ پر یہ حق ہے کہ میں تمھاری اجتماعی آمدنی میں سے ایک حبہ تم سے نہ چھپاؤں، اور تمھارا مجھ پر یہ حق ہے کہ میں تمھیں ہلاکت میں نہ ڈالوں، اور جب تم مسلمانوں کے کام کی وجہ سے گھر سے باہر ہو تو جبتک تم لوٹ نہ آؤ، میں تمھارے بچوں کا باپ بنا رہوں۔

یہ کلمات کہہ کر میں اپنے اور تمہارے لئے اللہ سے مغفرت طلب کرتا ہوں"۔

(حیاۃ الحیوان ص ۴۶ ج اول)

(تبصرے کے لئے ہر کتاب کے دو نسخے ارسال فرمائیے)

اعتذار گذشتہ ماہ کے البلاغ میں "رباعیات قدسی" کے تبصرہ میں بعض الفاظ سے مصنف مدظلہٗ کے اس جہاں گذراں سے تشریف لے جانے کا وہم ہوتا ہے، حالانکہ موصوف بفضل خدا ابھی حیات ہیں، اور بھون ضلع جہلم میں اقامت پذیر ہیں مدظلہٗ العالی! (نعمانی)

انڈکس قرآنی
یعنی فہرست احکام قرآنی

تالیف: سید معصوم علی صاحب سبزواری
ناشر: ادارہ تعلیم انسانیت

۱۴۵ مسجد روڈ بہار کالونی کراچی ۲

ضخامت ۵۰۲ صفحات۔ کاغذ سپر کلینڈرڈ

کتابت و طباعت آفسٹ!

قیمت عام دس روپے مع محصول ڈاک۔ معاونین: خواص ملت سربراہان ملک جو عطا فرمائیں۔

زیر تبصرہ کتاب اپنی ترتیب کے لحاظ سے بالکل نوکھی اور بہت دلچسپ و مفید ہے، ہر دور، ہر زمانہ میں مسلمانوں کے مختلف مکاتب فکر کے علمائے کرام نے قرآن شریف کی مختلف جہات سے بڑی قابل قدر خدمات انجام دی ہیں اور چونکہ قرآن کریم اللہ کے آخری رسول پر نازل ہونے والی وہ آخری کتاب ہے جو تا قیام قیامت محفوظ و باقی رہنے والی ہے، اس لئے اس کی خدمت کا سلسلہ بھی جاری و ساری ہے، دنیا کی کوئی قابل ذکر زبان ایسی نہیں جس میں قرآن کریم کے متعلق قابل لحاظ مواد نہ پایا جاتا ہو۔ اردو زبان کا گلستاں بھی خدمت قرآن کے سدا بہار پھولوں سے مہکتا رہا ہے، گذشتہ تین صدیوں سے اردو زبان میں قرآن شریف کی خدمت کا جو سلسلہ شروع ہوا ہے، وہ اچھی خاصی وسعت اختیار کر گیا ہے۔

قرآنی موعظت اور تذکر کے جو جواہر پارے مختلف ابواب اور موضوعات میں بکھرے پڑے ہیں، ان کو چن چن کر مرتب و مرتبط لڑیوں میں پرونے اور سجانے کے لئے نیز اپنے اپنے دور کے تقاضوں کے مطابق امت کے سامنے پیش کرنے کے لئے اہل قلم علماء ہمیشہ کمربستہ رہے ہیں۔ باعتبار مضامین قرآن کی فہرستیں بھی بہت لکھی گئیں جن سے عام مبلغین، مصنفین اور قرآن سے ذوق رکھنے والے حضرات کے لئے کافی سہولتیں اور آسانیاں پیدا ہوئیں۔

محترم سید معصوم علی صاحب سبزواری بھی قرآن کی خدمت کرنے والے انہیں خوش نصیب بزرگوں کی فہرست

میں شمار کئے جانے کے صحیح مستحق ہیں!

آپ نے فہرست احکام قرآنی کا جو سلسلہ شروع فرمایا ہے وہ انشاء اللہ اکیس جلدوں میں پورا ہوگا۔ اس پیرانہ سالی میں جبکہ آپ عمر کی پچاسی چھیاسی منزلیں طے فرما چکے ہیں، خدمت قرآن کے جذبۂ جواں کو دیکھ کر کہنا پڑتا ہے ذلک فضل اللہ یوتیہ من یشاء۔ اور اللہ تعالےٰ کے اس فضل و کرم ہی نے ان سے اکیس جلدوں کے مسودہ کی تکمیل کرادی ہے۔ نظر ثانی کا کام باقی ہے۔ جس کو وہ شبانہ روز سولہ گھنٹے کی محنت شاقہ سے پورا کر رہے ہیں۔

اور زیر تبصرہ کتاب اس سلسلہ کی پہلی کتاب ہے یعنی کتاب الاخلاق۔ اور کتاب الاخلاق کے بھی تین ابواب میں سے پہلے باب کا حصہ اول۔

مصنف مدظلہٗ نے کتاب الاخلاق کو تین ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ (۱) اخلاق حسنہ، حصہ اول و حصہ دوم (۲) اخلاق سیئہ، اور (۳) اخلاق متفرقہ۔ اور یہ ۲۷۵ صفحات پر پھیلی ہوئی کتاب اخلاق حسنہ کا حصہ اول ہے

قیاس کن ز گلستان من بہار مرا!

اتنا عظیم الشان کام بغیر توفیق ایزدی کے پورا ہونا مشکل ہے۔

اتنے قیمتی کاغذ اور ایسی حسین و دلکش کتابت و طباعت پر چھپنے والی ۲۷۵ صفحات کی کتاب کا ہدیہ دس روپے۔ واقعی اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ مصنف مدظلہٗ اس کے ذریعہ جلب منفعت کی تمنا نہیں رکھتے!

صاحب ہمت و استطاعت اہل خیر سے ہماری درخواست ہے کہ وہ اس کے زیادہ سے زیادہ نسخے خرید کر۔ مدارس، مساجد، دار المطالعوں، اور کتب خانوں کو مہیا فرمائیں تاکہ خدمت قرآنی کے اس طویل و مہتم بالشان سلسلہ کی تکمیل مصنف مدظلہٗ اپنی زندگی ہی میں ملاحظہ فرمالیں۔

ہم محترم مولانا محمد یوسف صاحب بنوری مدظلہٗ کے اس خیال سے متفق ہیں کہ متن قرآن کو ضرور درج کیا جانا چاہئے قرآنی کلمات کی برکت اور اس کی تلاوت کے اجر و ثواب کی محرومی کے علاوہ "اردو قرآن" کے سلسلہ اور تحریک کو تقویت پہنچنے کا خدشہ بھی ہے جس کی کسی نہج حوصلہ افزائی نہیں ہونی چاہئے

آخر میں ہم اپنے سرپرست گرامی قدر حضرت مفتی اعظم مولانا محمد شفیع صاحب مدظلہٗ کے اس کتاب کے متعلق دعائیہ کلمات پر اپنے مختصر تبصرہ کا اختتام کرتے ہیں۔

"دعا ہے کہ حق تعالےٰ اس کتاب کو حسن قبول عطا فرمادیں اور مؤلف سلمہ کو خیر دارین عطا فرمادیں۔"

(نعمانی)

پیغام حرم

۳۰×۲۰ سائز کے ۴۴ صفحات سفید کاغذ۔ کتابت طباعت عمدہ

پیشکش: ادارہ سماجی بہبود گلی نمبر ۱۲ گاندھی نگر کراچی ۳۰

ادارہ سماجی بہبود، جیساکہ اس کے نام سے ظاہر ہے ایک خدمتی اور رفاہی ادارہ ہے، جو اپنے وسائل کے مطابق خلق کی ۲ سال سے خاموش خدمت کر رہا ہے۔

اس کے مقاصد میں سے پہلا اور اہم مقصد اسلام کے بنیادی احکام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کی نشر و اشاعت کرنا ہے۔

اور زیر تبصرہ رسالہ اس مقصد کی تکمیل کی جانب پہلا قدم ہے جو بروقت سلیقہ کے ساتھ اٹھایا گیا ہے۔ اس رسالہ میں مرحوم و موجود علمائے امت کے قابل عمل اور لائق قدر مضامین کا انتخاب کارکنان کے حسن ذوق کے ساتھ ساتھ دین سے محبت کا کھلا ثبوت ہے! مشہور شعراء کی منظومات بھی شریک اشاعت ہیں۔

نظم و نثر کا یہ خوبصورت گلدستہ جسے دو رنگہ آرٹ پیپر ٹائیٹل — جو خانہ کعبہ کی شبیہ سے مزین ہے۔ مزید چار چاند لگا رہا ہے، ادارہ کے پتہ بالا سے مفت طلب کیا جاسکتا ہے

ہم کارکنان ادارہ کی اس پیش کش کا خیر مقدم کرتے اور

دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالٰے ان کے عزائم میں پختگی ارادوں میں برکت عطا فرماوے، ان کی پرخلوص خدمت کو قبول فرماکر مزید بیش از بیش دینی و اصلاحی خدمت کی توفیق بخشے۔ (نعمانی)

تنقید متین بر تفسیر نعیم الدین

تصنیف مولانا ابوالزاہد محمد سرفراز خانصاحب
ناشر:- انجمن اسلامیہ گکھڑ ضلع گوجرانوالہ
۲۰×۳۰/۱۶ کے ۲۲۴ صفحات سفید کاغذ۔
قیمت ۲/۵۰، کتابت و طباعت مزید توجہ کی محتاج۔

مولانا محمد سرفراز خاں صاحب کو اللہ تعالٰے نے جس علمی صلاحیت اور تحریر کی قادر الکلامی کی صفت سے نوازا ہے وہ قابل غبطہ ہے اور اس صلاحیت کا جو بھرپور مظاہرہ آپ نے اپنے دیگر دینی و تدریسی مشاغل اور صحت کی ناہمواری کے باوجود فرمایا ہے وہ دینی خدمت کرنے والے حضرات کیلئے لائق تقلید ہے۔

مختلف موضوعات پر آپ کی جو درجن سے زائد کتب شائع ہوچکی ہیں۔ اور ان میں ایک خاص مکتبہ فکر کے "علما" کا جو تعاقب فرمایا ہے، وہ نہ صرف مسکت اور دلچسپ ہے بلکہ سادہ دل مسلمان کے ایمان کی حفاظت کا ضامن بھی۔

زیر تبصرہ کتاب جناب مولانا احمد رضا خانصاحب بالقابہ کے ترجمۂ قرآن، اور جناب مولانا نعیم الدین صاحب مرادآبادی کے تفسیری حاشیہ کا سرسری علمی اور تحقیقی جائزہ ہے مترجم اور محشی صاحبان جس نقطۂ نظر کی ترجمانی فرماتے ہیں، بہت سے مقامات پر وہ خود انھیں کا تصنیف فرمودہ ہے اسلاف کرام کی تصانیف سے چونکہ اس نقطۂ نظر کی کوئی تائید نہیں ملتی اس لئے بعض جگہ یہ "تفسیر" "تحریف" کی حدود میں داخل ہوگئی ہے!

ایسے ہی مواقع کی نشاندھی، مولانا موصوف نے زیر تبصرہ کتاب میں فرماکر بتایا ہے کہ اسلاف کرام نے اس کی کیا تشریح و تفسیر فرمائی ہے!

تنقید کا انداز، جارحانہ نہیں، ہمدردانہ ہے۔ اور جس کے پیش نظر سرور عالم و عالمیان صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی الدین النصیحۃ ہو، وہ کیسے جارحانہ انداز اختیار کرسکتا ہے وہ تو سراپا دل سوزی اور مجسم ہمدردی بن کر ہی اپنے بھٹکے ہوئے بھائیوں کو صراط مستقیم دکھانے کی آرزو اور تمنا رکھتا ہے!

یہ کتاب بھی اسی جذبۂ ہمدردی کا بھرپور مظاہرہ ہے اور ہمیں امید ہے کہ اسی نقطۂ نظر سے اس کا مطالعہ کیا جائیگا۔ (نعمانی)

ذکر الٰہی

مرتب:- مولانا وکیل احمد شروانی، جامعہ اشرفیہ نیلا گنبد لاہور
قیمت:- ۱/۵۰ (مرتب کے پتہ سے مل سکتی ہے)

کاغذ سفید، کتابت عمدہ، آفسٹ کی حسین چھپائی، اور دیدہ زیب رنگین ٹائیٹل سے مزین، ۹۶ صفحات:

زیر تبصرہ رسالہ جناب مولانا مسیح اللہ خاں صاحب مدظلہٗ (ساکن جلال آباد- ہند) کا ایک وعظ ہے جس میں ذکر اللہ کی اہمیت، ضرورت اور حقیقت اور اس کے فوائد کے ساتھ اس سے غفلت، لاپرواہی کے نقصانات کو سادہ، عام فہم اور مؤثر و دلنشین پیرایہ میں بیان فرمایا گیا ہے۔

مولانا موصوف حکیم الامت حضرت مولانا تھانوی رح کے صحبت یافتہ اور خلیفۂ مجاز ہیں، آپ کے بیان میں اپنے مرشد قدس سرہٗ کے انداز بیان کی جھلک نمایاں ہے، اس میں عام مواعظین اور کم علم مقررین کے وعظوں کی طرح نہ رطب و یابس کا طومار ہے، نہ عوام کے بگڑے ہوئے مذاق کو تسکین دینے والے چٹخارے،

البتہ اہل علم کا سا رکھ رکھاؤ، اور اہل اللہ کا سا مؤثر و پروقار لہجہ از ابتدا تا انتہا قاری کی دلبستگی کا ضامن بنا نظر آتا ہے!

اس رسالہ کی اصل خوبیاں تبصرہ سے نہیں خود اس رسالہ کے مطالعہ ہی سے واضح ہوسکتی ہیں۔ اس لئے ہم اپنے قارئین سے اس کے مطالعہ کی سفارش کرتے ہیں (نعمانی)

ترجمہ : عزیز الرحمٰن سواتی - سال ہشتم - دار العلوم - کراچی

حسن بصریؒ کا خط

عمر بن عبد العزیزؒ کے نام

جب حضرت عمر بن عبد العزیزؒ خلیفہ ہوئے تو آپ نے اس وقت کے مشہور محدث اور فقیہ حضرت حسن بصری کو ایک خط لکھا جس میں ان سے ایک عادل حکمران کی خصوصیات معلوم کی گئی تھیں، حسن بصریؒ نے جواب میں مندرجہ ذیل اوصاف لکھ کر بھیجے۔

امیر المؤمنین! اللہ تعالیٰ نے عادل حکمران کے ذمہ یہ فرائض عائد کئے ہیں کہ وہ ہر کج کو سیدھا کرے۔ ہر بھٹکے کو راستے پر لگائے، ہر بگڑے کی اصلاح کرے۔ ہر کمزور کی مدد کرے، ہر مظلوم کو انصاف دے اور ہر مصیبت زدہ کی جائے پناہ بن جائے۔

> امیر المؤمنین! عادل حکمران جسم کے اعضاء کے درمیان ایک دل ہی کی طرح ہے؟ جب دل صحتمند ہوتا ہے تو باقی اعضاء بھی اپنا کام صحیح طریقے سے کرتے ہیں اور جب دل بگڑتا ہے تو اعضاء بھی بگڑ جاتے ہیں۔
>
> حسن بصریؒ

امیر المؤمنین! عادل حکمران کی مثال اس چرواہے کی طرح ہے جو اپنے اونٹوں پر نہایت درجہ کا شفیق اور ان کے ساتھ نرمی سے پیش آنے والا ہو۔ ان کے لئے بہترین چراگاہ تلاش کرتا ہو اور ہلاکت و تباہی کے گڑھوں سے ان کو بچاتا ہو، درندوں کی دست و برد سے ان کی حفاظت کرتا ہو۔ اور سردی و گرمی کی مضرتوں سے دور رکھنے کیلئے ان پر سایہ کرتا ہو۔

امیر المؤمنین! عادل حکمران اس شفیق باپ کی طرح ہے جو اولاد کے لئے ان کے بچپن میں دوڑ دھوپ کرے جب وہ بڑے ہو جائیں تو انھیں تعلیم دلائے، اپنی زندگی میں ان کے لئے کماتا رہے۔ اور اپنی موت کے بعد ان کے لئے ذخیرے کا انتظام کرے۔

امیر المؤمنین! عادل حکمران کی مثال اس نیک ماں کی طرح ہے جو اپنے بچے کو مشقت سے اٹھائے رکھتی ہے، پھر تکلیف سے اس کو جنتی ہے اور بچپن میں اس کو تربیت دیتی ہے، جب وہ تکلیف میں ہوتا ہے تو یہ بھی بے چین رہتی ہے اور جب اسے آرام ہوتا ہے تو یہ بھی

راحت محسوس کرتی ہے، کبھی اس کو دودھ پلاتی ہے۔ اور کبھی چھڑا لیتی ہے۔ جب وہ تندرست ہوتا ہے تو یہ بھی خوش و خرم نظر آتی ہے اور جب اسے شکایت ہوتی ہے تو یہ بھی غمگین ہو جاتی ہے۔

امیر المؤمنین! عادل حکمران یتیموں کا سرپرست اور مساکین کا خزانچی ہوتا ہے، جب یہ بچے ہوتے ہیں تو ان کی تربیت کرتا ہے اور جب بڑے ہو جاتے ہیں تو ان کا سرپرست رہتا ہے۔

امیر المؤمنین! عادل حکمران جسم کے اعضاء کے درمیان ایک دل ہے، جب دل صحت مند ہوتا ہے تو باقی اعضاء بھی اپنا کام صحیح طریقہ سے کرتے ہیں اور جب دل بگڑتا ہے تو اعضاء بھی بگڑ جاتے ہیں۔

امیر المؤمنین! عادل حکمران اللہ اور اس کے بندوں کے درمیان ایک واسطہ ہوتا ہے وہ اللہ کے کلام کو سنکر اس کے بندوں تک پہنچاتا ہے، اللہ کو خود دیکھتا ہو اور دوسروں کو دکھاتا ہے، اللہ کے سامنے جھکتا ہے اور دوسروں کی رہنمائی کرتا ہے۔ پس اے امیر المؤمنین اللہ نے آپ کو جو اختیارات دیئے ہیں ان اختیارات کو آپ اس غلام کی طرح استعمال نہ کیجئے جس پر اس کا آقا اعتماد کرکے اسے اپنے مال اور اپنی اولاد کا محافظ مقرر کرتا ہے تو وہ اس مال کو ہلاک کر ڈالتا ہے، اولاد کو ضائع کر دیتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کا آقا مال اور اولاد دونوں کے لئے محتاج بن کر رہ جاتا ہے۔

امیر المؤمنین! اللہ تعالیٰ نے حدود و تعزیرات اس لئے نازل کئے ہیں کہ اس کے ذریعہ لوگوں کو منکرات و فواحش کے پاس جانے سے روکا جائے

پس وہ وقت کتنا برا ہوگا جب ان فواحش کا مرتکب خود وہ شخص ہے جو ان حدود کو نافذ کرنے کا ذمہ دار تھا —

اور اللہ تعالیٰ نے قصاص کا حکم بھی اس لئے مقرر کیا ہے کہ اس میں اس کے بندوں کی زندگی ہے۔ پس کس قدر خراب وقت ہوگا وہ جب قصاص لینے کا ذمہ دار ہی قتل کے جرائم میں ملوث ہو — یاد کیجئے اس وقت کو جب موت آئے گی اور آپ کی کوئی پارٹی یا آپ کا باڈی گارڈ آپ کی مدد نہیں کر سکے گا — اس لئے موت اور گھبراہٹ کے اس وقت کے لئے توشہ تیار کیجئے۔

امیر المؤمنین! آپ اپنے مکان کی طرف جانے والے ہیں جو آپ کے اس وقت کے مکان سے مختلف ہے اس میں آپ کا قیام طویل ہوگا۔ آپ کے عزیز اور دوست آپ سے بچھڑ جائیں گے۔ اور لوگ آپ کو ایک تاریک گڑھے میں تنہا چھوڑ کر واپس آجائیں گے۔ تو آپ ابھی سے اپنے لئے رفیق تلاش کیجئے۔

یوم یفر المرء من اخیہ	جس دن بھاگے گا آدمی اپنے بھائی سے
وامہ وابیہ وصاحبتہ	اپنی ماں سے، اپنے باپ سے، اپنی بیوی سے
وبنیہ۔	اور اپنے بیٹوں سے۔

امیر المؤمنین! آپ اللہ کے بندوں پر جاہلوں جیسا حکم نہ لگایئے اور ان کے ساتھ ایسا معاملہ نہ کیجئے، جیسا کہ ظلم کے راستے پر چلنے والے کرتے ہیں، آپ کمزوروں پر جابر حکمرانوں کو مسلط نہ کیجئے، یہ لوگ کسی مومن کے بارے میں قرابت اور عہد کا پاس نہیں کرتے ورنہ تو آپ اپنے گناہوں کو لے کر چلیں گے اور ان کے ساتھ دوسرے گناہ بھی لادیں گے۔ آپ اپنا بوجھ بھی اٹھائیں گے اور اس کے ساتھ دوسروں کے بوجھ بھی آپ پر لادیں گے۔

آپ یہ نہ دیکھیں کہ اس وقت آپکو قوت واقتدار حاصل ہے آپ یہ دیکھیں کہ کیا کل اس وقت بھی آپ قدرت والے ہوں گے جب موت کی رسیاں آپ کو جکڑے ہوئے ہوں گی ... آپ اللہ کے سامنے کھڑے ہوں گے، یہ وقت وہ ہوگا کہ فیصلے کا اختیار صرف اللہ کو ہوگا اور تمام مخلوقات، جن و انس کے سامنے جھکی ہوں گی۔

آپ ان لوگوں کے دھوکے میں نہ آئیے جو آرام وراحت کے سامان میں پل کر آپ کی پریشانی اور تنگی کا سبب بنتے ہیں۔ وہ دنیا کے ناز و نعم میں مست ہیں۔ اور آپ کی آخرت کی نعمتوں کو ضائع کر رہے ہیں —— آپ یہ نہ دیکھیں کہ اس وقت آپ کو قدرت و اقتدار حاصل ہے —— آپ یہ دیکھیں کہ کیا کل اس وقت بھی آپ قدرت والے ہوں گے جب موت کی رسیاں آپ کو جکڑے ہوئے ہوں گی۔ اللہ کے انبیاء و مرسلین اور اس کے فرشتوں کے عظیم الشان مجمع میں آپ اللہ کے سامنے کھڑے ہوں گے۔ یہ وقت وہ ہوگا کہ فیصلے کا اختیار صرف اللہ کا ہوگا اور تمام مخلوقات اس حی و قیوم کے سامنے جھکی ہوں گی۔

امیر المومنین! میں اگرچہ اپنی نصیحت میں اس مقام تک نہیں پہونچ سکا جس تک کہ مجھ سے پہلے عقلمند حکماء پہنچے ہیں، تاہم میں نے آپ کے لئے شفقت و خیر خواہی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی میرے اس خط کو ایسا سمجھ لیجئے جیسا ایک شخص اپنے دوست کا علاج کرتا ہو اور اسے کڑوی کسیلی دوائیں پلاتا ہو اس امید پر کہ اسے عافیت اور تندرستی نصیب ہوگی۔

والسلام علیک یا امیر المومنین ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

الوصایا الخالدۃ ص ۱۳۵

حضرت سعید بن سویدؒ کا ایک خطبہ

لوگو! اسلام ایک محفوظ دیوار اور مضبوط دروازہ رکھتا ہے اسلام کی دیوار حق اور اس کا دروازہ عدل ہے۔ اسلام اس وقت تک محفوظ رہے گا جب تک اس کی قوت رہے گی۔ لیکن اس کی قوت تلوار سے قتل کرنا اور کوڑے سے مارنا نہیں۔ بلکہ اسلام کی قوت حق کے مطابق فیصلہ کرنا اور عدل و انصاف کے راستہ پر چلنا ہے۔

(الوصایا الخالدۃ ص ۱۲۳)

سخنہائے گفتنی

اسلامی معاشرہ جن زرین اصولوں کی بنا پر دنیا بھر کے لئے باعث رحمت تھا، افسوس ہے آج وہ مسلمانوں کی غفلت اور بے پروائی کے سبب اپنے اور غیروں کے لئے زحمت کا سبب بنا ہوا ہے!

آداب معاشرت کا ایک اہم اصول، ایک ادب یہ ہے کہ، مسلمان کے ہاتھ زبان اور برتاؤ سے کسی مسلمان کو اذیت نہ پہنچے، ہر مسلمان اس کا دل و جان سے قائل کو نظر آئے گا، مگر جب عمل اور برتاؤ کا ہنگام ہوگا تو لمحہ بھر سوچے گا بھی نہیں کہ اس سے کوئی دلگیر تو نہیں ہوگا۔

یہ سطور لکھنے کا باعث ہمارے بہت سے محترم قارئین کا طرز عمل ہے۔

ہم بار بار لکھ چکے ہیں کہ آپ البلاغ سے متعلق خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر ضرور تحریر فرمایئے، مگر ہمارے اکثر قارئین یا تو ہماری ان سطور کا مطالعہ نہیں فرماتے، یا پھر اس کو کوئی اہم بات نہیں سمجھتے، اور نہ اسے باعث پریشانی و اذیت خیال کرتے ہیں، مجبور ہو کر ہم اپنے قارئین سے عرض کرتے ہیں کہ جو صاحب ایسا کرتے ہیں ہمیں ان کی روش سے اذیت پہنچتی ہے۔ اور ان اذیت پہنچانے والے حضرات کے لئے دعا کے ساتھ ساتھ یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ ان کے کسی حکم کی تعمیل نہ کی جائے گی۔ نہ خط کا جواب دیا جائے گا، نہ شکایت پر توجہ کی جائے گی!

آداب تحریر کا ادب اور اصول یہ بھی ہے کہ اگر کسی بات کا جواب درکار ہو تو مکتوب الیہ کو جواب کے لئے اپنے پتہ کا جوابی کارڈ یا لفافہ ضرور بھیجنا چاہئے!

ہم ایسے حضرات کو جو جواب کے لئے کارڈ، ٹکٹ، لفافہ نہیں بھیجتے جواب سے محروم رکھنا پسند تو نہیں کرتے، مگر اسلامی معاشرہ کے ایک مردہ ادب کے احیاء کی خاطر اعلان کرتے ہیں کہ، ایسے حضرات کو دفتر سے جواب نہ ملے تو شکوی فرمائیں (انتظار)!

بدگمانی اور الزام تراشی سے اللہ ہر مسلمان کو بچائے، قحط الرجال، کثرت کار، اور ہجوم مشاغل کے باوجود ہماری کوشش یہی ہوتی ہے کہ، کسی بھی خریدار کا رسالہ دفتر ہی کوتاہی سے روانہ ہونے سے نہ رہ جائے، اور بحمد للہ اب تک ایسا نہیں ہوا۔ مگر اس کے باوجود جب بعض خریداروں کو "آفت ڈاک" کی وجہ سے رسالہ نہیں ملتا تو وہ غصہ کے ساتھ ساتھ، بدگمانی اور الزام دفتر ہی کے سر ڈالتے ہیں، ہمارے لئے تو یہ بات باعث اجر بن جاتی ہے۔ مگر ہم اپنے ایک دینی بھائی کا دینی نقصان کیسے گوارا کر سکتے ہیں ۔۔۔ اس لئے ہمارا مشورہ اور گذارش ہے کہ جب آپ کو رسالہ نہ ملے اور اسلامی مہینہ کی ۱۵ تاریخ (مغربی پاکستان کیلئے) اور ۱۰ تاریخ اگلے ماہ مشرقی پاکستان کے لئے، گذر جائے تو آپ خریداری نمبر کے حوالہ کے ساتھ ہمیں صرف یہ لکھ بھیجئے، کہ رسالہ نہیں ملا۔ ہم انشاء اللہ دوبارہ آپ کو رسالہ بھیجدیں گے۔

بعض دفعہ حادثہ یہ صورت بھی اختیار کر لیتا ہے کہ دوبارہ بھیجا ہوا رسالہ بھی کوئی اُچک لیتا ہے، ایسی صورت میں بھی ہم انشاء اللہ رسالہ بھیجیں گے مگر بیرنگ!

اتنی گزارش اور ہے کہ رسالہ نہ ملنے کی صورت میں [illegible]

بھی اس کی اطلاع ضرور دیجئے۔

رسالہ دیر سے پہنچنے اور بالکل نہ پہنچنے اور مسلسل کئی کئی ماہ تک نہ پہنچنے کی شکایات مشرقی پاکستان کے کرم فرماؤں کو بہت ہیں، اور ہم پریشان ہیں کہ ان شکایتوں کا مداوا کس طرح کریں۔ دیر سے پہنچنے کی توخیر یہ وجہ ہو سکتی ہے کہ رسالہ بحری ڈاک سے جاتا ہے جو ایک ماہ تو غالباً مؤخر ہو ہی جاتا ہے اور اس کا تدارک بھی ہو سکتا ہے کہ رسالہ ہوائی ڈاک سے بھیجا جائے مگر ہوائی ڈاک کا محصول عام محصول سے تقریباً سات آٹھ گنا زیادہ ہے جسے البلاغ کسی صورت بھی برداشت نہیں کر سکے گا، کیونکہ اس کی عام قیمت اور سالانہ چندہ پہلے ہی بہت کم ہے۔

اس کے ساتھ ہم یہ بھی نہیں چاہتے کہ اپنے مشرقی پاکستان کے بھائیوں پر بار ڈالنے کا از خود کوئی فیصلہ کریں۔ لہٰذا یہ فیصلہ ہم انھیں پر چھوڑتے ہیں کہ اگر وہ اپنا پرچہ ہوائی ڈاک سے منگوانا چاہیں تو چھ روپے کے بجائے آٹھ روپے سالانہ چندہ بھیجیں!

اب رہی گم شدگی کی بات! تو جو معاشرہ خدا اور آخرت کے خوف سے آزاد ہو، اور جس کے افراد دینی رشتہ کے بجائے، قومی، ملکی، وطنی اور لسانی رشتوں کو اہمیت دینے لگ جائیں، وہاں یہی کچھ ہو سکتا ہے! اس معاملہ میں بجز صبر اور دعا نہ ہم کچھ کر سکتے ہیں نہ ہمارے قارئین محترم!

بہر کیف ہم اپنے مشرقی پاکستان کے خریدار حضرات سے گذارش کرتے ہیں کہ وہ رسالہ نہ ملنے کی اطلاع ہمیں اور اپنے حلقہ کے پوسٹ ماسٹر کو دیدیا کریں ہم دوبارہ ان کو رسالہ بھیجدیں گے۔

مشرقی پاکستان کی مندرجہ بالا صورت حالات کے پیش نظر ایک تجویز یہ بھی زیر غور ہے کہ ڈھاکہ میں "البلاغ" کا ذیلی آفس قائم کر دیا جائے! اور مشرقی پاکستان کے خریداروں و ایجنٹوں کو البلاغ کی ترسیل ڈھاکہ آفس سے ہی کی جائے! اس کے لئے مناسب اور ذمہ دار، دینی خدمت کا جذبہ رکھنے والے کوئی صاحب میسر آ گئے تو انشاء اللہ جلد ہی یہ انتظام کر دیا جائے گا!

قارئین میں سے کوئی صاحب یہ ذمہ داری سنبھالنا چاہیں یا ان کی نظر میں کوئی موزوں آدمی ہو! یا اس تجویز کے متبادل کوئی اور بہتر تجویز ان کے خیال میں ہو تو دفتر کو مطلع فرمائیں۔

اس سلسلہ کے متعلق نیز انتظامی اور دفتری امور سے متعلق جملہ خط و کتابت بنام مدیر انتظامی کی جائے!

...

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ

نعمانی